معارف

فروری ۲۰۱۹ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپئے۔ فی شمارہ ۲۵/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپئے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

(Office Mobile) 09170060782

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری رمنیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۳ | ماہ جمادی الآخر ۱۴۴۰ھ مطابق ماہ فروری ۲۰۱۹ء | عدد ۲

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

امام مالکؒ کی فقہ کو وہ قبول عام حاصل نہیں ہوا جس کی وہ مستحق تھی۔ اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ لم یقم بہ اصحابہٗ۔ ان کے تلامذہ اس کا حق ادا نہ کر سکے۔ یہ شکایت علامہ شبلی کے تلامذہ کے بارے میں نہیں کی جا سکتی۔ ہماری تاریخ میں بہت سے ایسے اساتذہ گذرے ہیں جن کے لائق شاگردوں نے ان کا نام روشن کیا اور حق شاگردی ادا کر دیا۔ لیکن علامہ شبلی کے تلامذہ نے سعادت کوشی، محبت اور وفاداری کا جو معیار قائم کر دیا ہے وہاں تک پہنچنے کی عزت کم لوگوں کو ہی ملی ہوگی۔ علامہ شبلی اپنی زندگی کے سب سے بڑے خواب دارالمصنّفین کو تعبیر سے ہم کنار کرنے کے لیے ابھی ابتدائی اقدامات ہی میں مصروف تھے کہ ان کی مہلت حیات ختم ہوگئی۔ البتہ انہوں نے اس کے بنیادی خط وخال اور رہنما اصول ضرور فراہم کر دیے تھے۔ اس خاکہ میں رنگ بھرنے اور اس کی حقیقی صورت گری کا کام ان کے لائق تلامذہ نے انجام دیا اور اس خوبی سے انجام دیا کہ لوح ایام پر اس کا لازوال نقش ثبت ہو گیا۔ انہوں نے استاد کے مشن کی تکمیل میں اپنے آپ کو مٹا دینے کی ایک مثال قائم کر دی۔ نہ تو انہوں نے راستے کی مشکلات کی پروا کی اور نہ حب جاہ و مال کی کشش ان کا راستہ کھوٹا کر سکی۔ انہوں نے استاد کے خواب دارالمصنّفین کو اس طرح پورا کیا کہ اگر علامہ جیسا کمال پسند اور اعلیٰ ذوق کا حامل بھی اس کو دیکھتا تو بے اختیار احسنت اور مرحبا کہہ اٹھتا۔ شبلی منزل سے شبلی اکیڈمی تک کا سفر دراصل قطرے سے گہر ہونے تک کا سفر تھا۔ جو اس راہ سے گذرے ان کے علاوہ کوئی اور اس کی مشکلات کا کیا اندازہ کر سکتا ہے۔ ان کی بے مثال قربانیوں نے علم ودانش کا ایک ایسا تاج محل تعمیر کیا جس کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ رہ جائیں۔ اس کی کوئی مثال نہیں۔ جب برصغیر جیسی وسیع وعریض مملکت مسلمانوں کے زیر نگیں تھی اور اس کے لامحدود وسائل ان کے زیر تصرف تھے اس وقت بھی وہ ایسی کوئی چیز نہ بنا سکے۔ علم کی یہ مملکت ان بوریہ نشینوں نے قائم کی جن کے سینے علم سے روشن اور دل استاد کی محبت سے معمور تھے۔ مصر سے اس کی زیارت کے لیے آنے والے عالم کو علم کی جو مملکت یہاں نظر آئی وہ انہوں نے کہیں نہیں دیکھی تھی۔ بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری۔

دارالمصنّفین کی گولڈن جوبلی کے موقع پر انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا نے دارالمصنّفین کو نالندہ، ٹیکسیلا، قاہرہ اور ماوراء النہر کے عظیم علمی مراکز سے تشبیہ دی تھی۔ لیکن اس سلسلہ میں بغداد کا ذکر رہ گیا۔ ہماری تاریخ میں بیت الحکمت ہی وہ واحد ادارہ ہے جسے دارالمصنّفین کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ البتہ دونوں کے درمیان ایک بڑا فرق ہے۔ بیت الحکمت کے پیچھے عظیم عباسی خلافت کے دور عروج کے لامحدود وسائل تھے۔ دارالمصنّفین کے بوریہ نشینوں کے پاس صرف توکل اور غیر متزلزل عزم کی دولت تھی۔ بیت الحکمت نے علوم کی تاریخ میں پرانے علوم کو عربی زبان میں منتقل کرنے اور اس طرح علوم کی ترقی کے عمل کو جاری رکھنے کے عمل کو یقینی بنانے کا غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔ لیکن اس

دائرہ کار سے باہر اس کا کوئی کام نہیں۔ دارالمصنّفین کی جہاں گیری کا دائرہ بہت وسیع ہے جس کا مرکزی نقطہ سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والتحیۃ ہے۔ پہلے کی تعمیر ایک اولوالعزم حکمراں کی علم دوستی اور معارف پروری کی رہین منت ہے تو دوسرے کی چند بوریہ نشینوں کے عزم وحوصلہ کی ممنون کرم۔ علامہ شبلی کے انتقال کے بعد مولانا حمیدالدین فراہی کی سرپرستی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی قیادت میں علامہ شبلی کے تلامذہ کی ایک مختصر سی جماعت نے چند برسوں کی قلیل مدت میں جس طرح دارالمصنّفین کی تعمیر و تشکیل کا کارنامہ انجام دیا وہ عزم وحوصلہ اور اخلاص ومحبت کی ایک لازوال اور ناقابل فراموش داستان ہے۔ استاد کے مشن کی توسیع اور ان کی زندگی کے حاصل سیرۃ النبیؐ کے منصوبہ کی تکمیل کے لیے مولانا سید سلیمان ندوی دکن کالج کی بیش قرار ملازمت اور مستقبل کے نہایت روشن امکانات سے بغیر کسی تامل کے دامن چھڑا کے چلے آئے اور پھر ادھر مڑ کر بھی نہیں دیکھا اور اپنی تمام تر صلاحیتیں اس کام کی نذر کردیں۔ پھر زندگی کے آخری مرحلہ میں ایک نامہربان موڑ پر جب ان کو اس کی جدائی کے کرب سے گذرنا پڑا تو اس سے پہلے وہ اپنا مشن پورا کرچکے تھے اور ان کے رفقاء اور تلامذہ کی جہد مسلسل سے علم ودانش کی دنیا میں دارالمصنّفین کا سکہ رواں ہوچکا تھا۔ مستند تھا اس کا فرمایا ہوا۔ ان کے رفقاء اور احباب مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی نے یک در گیر ومحکم گیر کے اصول کے مطابق استاد کی چوکھٹ کو اس طرح پکڑا کہ مولانا عبدالسلام ندوی تو اب بھی اسی کی آغوش میں محو خواب ہیں۔ علم وفضل کے ان سلاطین نے مدتوں بوریائے فقر سے علم کی مملکت پر حکمرانی کی۔ در فقیری پادشاہی کردہ اند۔ مدتوں علم وتحقیق اور زبان وادب کے میدان میں سب سے معتبر آواز دارالمصنّفین کی تھی۔ اس کے اکتسابات اور عطایا غیر معمولی ہیں۔ اس نے کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی ہے، ان کو فکری غذا فراہم کی ہے، اپنے روشن ماضی سے ان کا ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے استوار کیا ہے اور ان کے اندر اس پر فخر کرنے کا جذبہ بیدار کیا ہے، ان کے دلوں میں ملی دردمندی اور دل سوزی کی تخم ریزی کی ہے۔ اس کے اثرات کہاں کہاں اور کس کس انداز میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کا نقش کتنا گہرا اور دیرپا ہے اس کا صحیح اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ علامہ شبلی اور ان کے تلامذہ نہ ہوتے اور ان کی مساعی کا یہ پیکر جمیل دارالمصنّفین نہ ہوتا تو ہماری علمی اور فکری سطح وہ نہ ہوتی جو آج ہے۔ ان کے احسانات کے بوجھ سے ہماری گردنیں خم ہیں۔

معمار دارالمصنّفین مولانا سید سلیمان ندوی نے دارالمصنّفین کے استحکام اور اپنی علمی اور تحقیقی خدمات کے ساتھ ساتھ استاد کی تمام تصانیف کی اشاعت کا انتظام واہتمام کیا۔ اس سے بھی زیادہ اہم کام یہ کیا کہ علامہ کے بکھرے ہوئے آثار کو بڑی احتیاط، دقت نظر اور تفحص سے جمع کیا اور ترتیب وتدوین کے بعد ان کی اشاعت کا بندوبست کیا۔ مقالات کی آٹھ جلدیں، مکاتیب اور بعض دوسری کتابیں اسی زمرہ میں آتی ہیں۔ اخیر میں حیات شبلی لکھ کر علامہ کی اس خواہش کی تکمیل کا سامان کردیا کہ ''کبھی تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی لکھنا''۔ حیات شبلی ایک شاگرد رشید کا استاد گرامی قدر کی خدمت میں عقیدت ومحبت کا نذرانہ ہی نہیں ہے بلکہ اس عہد کے اسلامیان ہند کی تاریخ کا ایک

اعلیٰ درجہ کا مرقع بھی ہے۔ حیات شبلی ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی اور یہ سید صاحب کی آخری تصنیف ہے۔ اس کی اشاعت پر پون صدی کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس طویل مدت میں برصغیر کے طول وعرض میں اور اس سے باہر دنیا کے دوسرے خطوں میں علامہ کی شخصیت اور ان کی علمی اور فکری خدمات پر مثبت اور منفی دونوں نوعیت کا بہت کام ہوا ہے لیکن اس پورے عرصے میں دارالمصنّفین میں کسی وجہ سے اس محاذ پر ایک ناقابل فہم خاموشی چھائی رہی۔ یہ ایک بڑی کمی تھی جس کی تلافی ضروری تھی۔

جب ۲۰۰۸ء میں دارالمصنّفین کی تعمیرِ نو کا کام شروع کیا گیا تو اس فرض کی ادائیگی کا خیال دامن گیر ہوا۔ علامہ شبلی کی وفات پر ایک صدی بھی مکمل ہو رہی تھی۔ یہ خواہش ہوئی کہ مولانا سید سلیمان ندوی کے بعد دارالمصنّفین میں شبلیات کے موضوع پر تحقیق وتصنیف اور مطبوعات کا جو کام رکا ہوا تھا اسے پھر سے شروع کیا جائے اور ۲۰۱۴ء میں صدی تقریبات کے انعقاد سے پہلے اس سلسلہ میں مناسب حد تک کام پورا کرلیا جائے۔ یہ بات ہمارے لیے تشکر اور امتنان کی باعث ہے کہ اب اس سلسلہ میں کسی حد تک کام کیا جا چکا ہے اور ہمارے اپنے نقشہ کار کے مطابق اب وقت آگیا ہے کہ ان کے عالی مرتبت تلامذہ پر کام کا آغاز کیا جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کی ابتدا معمار دارالمصنّفین مولانا سید سلیمان ندوی سے ہوگی۔ چنانچہ یہ اعلان کرتے ہوئے ہم کو بے حد مسرت کا احساس ہو رہا ہے کہ انشاء اللہ اس سال نومبر میں مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی اور فکری خدمات پر ایک معیاری سیمینار کا انعقاد کیا جائے گا۔ کوشش یہ ہوگی کہ سیمینار سے پہلے اس سلسلہ میں جو کام ضروری ہیں ممکن حد تک ان کو پورا کرلیا جائے۔ سید صاحب کے جو آثار ابھی تک سامنے نہیں آسکے ہیں یا اب نایاب ہیں تلاش وجستجو کے بعد ان کو منظر عام پر لایا جائے اور ان سے استفادہ کی راہ باز کی جائے۔ اس کام کی ابتدا کردی گئی ہے۔ ان کی اردو نظموں کا مجموعہ ''ارمغان سلیمان'' بہت پہلے ۱۹۶۶ء میں پاکستان سے شائع ہو چکا ہے لیکن ابھی ہندوستانی شائقین کی دسترس میں نہیں ہے۔ انشاء اللہ جلد اس کی اشاعت کا انتظام کیا جائے گا۔ اسی طرح ''مکتوبات سلیمانی'' کے نام سے مولانا عبدالماجد دریابادی نے سید صاحب کے مکاتیب کو ۱۹۶۳ء میں دو جلدوں میں صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔ اب یہ یکسر نایاب ہے اور النادر کالمعدوم کے حکم میں داخل ہو چکی ہیں۔ اس قیمتی مجموعہ کو مولانا دریابادی کے ورثاء کی اجازت سے شائع کرنے کا منصوبہ ہے۔ کوشش ہوگی کہ یہ بھی سیمینار سے پہلے شائع ہو جائے۔ سید صاحب کے جو مقالات اور نگارشات ابھی تک مدون ہو کر شائع نہیں ہو سکی ہیں ان کی اشاعت کا بھی انشاء اللہ اہتمام کیا جائے گا۔ اس منصوبہ کے آغاز کی علامت کے طور پر معارف کے اس شمارہ میں سید صاحب کا ایک نادر عربی مرثیہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس مرثیہ کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ اس فرض کی ادائیگی کے بعد انشاء اللہ علامہ شبلی کے دوسرے شاگرد اور مولانا سید سلیمان ندوی کے رفیق کار مولانا عبدالسلام ندوی پر توجہ مرکوز کی جائے گی۔

مقالات

قصی کا نظام سیاست

جناب محمد طارق غازی

ہمارے مروجہ تعلیمی منہاج سے ایک نقصان یہ ہوا ہے کہ اپنی تاریخ کی عبقری مفکر شخصیات سے اکثر ہمارا تعارف ہی نہیں ہوتا اور جب ہم ہر میدان علم میں مغربی مفکرین کے کارناموں پر نظر کرتے ہیں تو بلا مشقت احساس کمتری کا شکار ہوجاتے ہیں کہ ہماری قوم میں ابتکاری، تحقیقی، علمی یا معاشرتی بات کہنے اور کرنے والا کوئی شخص کبھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک مستقل بحث اور موضوع تحقیق ہے جس پر سر دست گفتگو نہیں ہے۔ البتہ اتناذکر ضروری ہے کہ مثلاً فکری اور عملی سیاسیات میں رسول اللہؐ کے افکار و نظریات اور عمرانی تجربات اتفاقی مجمل تحریروں کے سوا ہماری علمی تحقیقی اور تجزیاتی روایت کا حصہ نہیں رہے، اسی کے ساتھ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ صحابہ میں خلفائے راشدین کے علاوہ نظریاتی سیاسیات میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا فکری سرمایہ اور اطلاقی اقتصادیات میں حضرت عثمانؓ بن حنیف انصاری کے کارنامے حیرت انگیز بھی ہیں اور امت میں غیر معروف بھی۔ اسلام سے پہلے بنی اسماعیل کے عربوں میں ایسی ہی ایک عبقری شخصیت قصی بن کلاب کی تھی جسے انسانی تاریخ میں وہ مقام بھی نہ مل سکا جو ہماری تعلیم گاہوں میں یونان کے پیریکلیس (Pericles) کو حاصل ہے۔

قصی بن کلاب بن مرہ پانچویں صدی کا قیداری قریشی مدبر تھا۔ کم عمری ہی میں اس کی فراست ظاہر ہونے لگی تھی۔ قیدار بن اسماعیلؑ کے سلسلۂ اولاد میں کلاب بن مرہ کے انتقال کے بعد اس کی یمنی ازدی بیوی فاطمہ بنت سعد نے شامی قبیلہ بنی عذرہ کے ربیعہ ابن حرام سے اس شرط پر شادی کرلی کہ ربیعہ اس کے کمسن بیٹے قصی بن کلاب کی کفالت وتربیت کرے گا۔ چنانچہ قصی کا بچپن مکہ کے بجائے شام میں گزرا۔ ان کا نام زید تھا، مگر چونکہ وطن سے دور رہنا پڑا تو قصی کے لقب سے

ڈائریکٹر امم اسٹڈیز ہاؤس، ٹورانٹو، کینڈا۔

معروف ہوا (امام عبدالرحمٰن سہیلی، الروض الانف ۱:۲۵)۔ایک بار وہ بنی عذرہ کے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا تو کسی لڑکے نے کہا کہ وہ ان کا ہمسر اور ہم جد نہیں ہے۔قصی نے تحقیق کی تو ماں نے بتایا کہ وہ زیادہ معزز قبیلہ قریش مکہ کا فرزند ہے۔قصی اپنی اصل کی تلاش میں مکہ آیا جہاں ان دنوں بنی خزاعہ کی حکومت تھی۔قصی نے حاکم مکہ حُلَیل بن حُبشِیہ خزاعی کی بیٹی حُبی سے شادی کرلی۔حلیل کا ولی عہد اس کا بیٹا ابوغشبان محترش تھا جس نے شراب کے مشکیزہ کے عوض اپنا حق حکومت اپنے بہنوئی قصی کو بیچ دیا تھا۔چنانچہ حلیل بن حبشیہ کے بعد قصی بن کلاب حاکم مکہ یعنی کعبہ کا متولی بن گیا۔اس حکایت سے قطع نظر بھی مکہ میں قصی کی سیادت کے جوہر نمایاں ہورہے تھے کہ بنی خزاعہ اور بنی بکر کو بجبر اس کی سرداری پر راضی ہونا پڑا۔

جرہم اور خزاعہ کے زمانہ میں حکومت مکہ کا اصل کام حجابت کعبہ تھا یعنی کعبہ کا متولی ہی دراصل حاکم مکہ ہوتا تھا۔مراسم حج کا انتظام، منیٰ وعرفات سے روانگی کی اجازت دینا، کاروانوں کا انتظام کرنا، ان سے ہونے والی آمدنی کو قبائل میں تقسیم کرنا، نواحی بازار عکاظ میں بیرونی قبیلوں اور قافلوں کی آمد کا پروانہ دینا اور وہاں تاجروں اور فنکاروں کے قیام کا انتظام بھی حاکم مکہ ہی کی ذمہ داریوں میں شامل تھے۔ظاہر ہے یہ بہت سادہ نظام تھا جس کے لیے اعلیٰ درجہ کی سیاسی استعداد ضروری نہیں تھی۔

ابتکاری سیاسی نظام: تقریباً ۴۵۰ عیسوی میں بنی اسماعیلؑ کے سیاسی، فلسفی و مدبر اور مقنن قصی بن کلاب نے ایک بالکل مختلف اور ابتکاری نظام کی بنیاد ڈالی تھی (حامد الانصاری غازی، اسلام کا نظام حکومت ۱۷۸)۔یہ نظام یونانی سیاسی تجربات سے بھی مختلف تھا اور دراوڑ۔آریہ دیہی انتظام عدلیہ سے بھی جداگانہ تھا۔یہ محض ایک دعویٰ نہیں۔اس کی حقیقت آئندہ سطور میں سامنے آجائے گی۔

بطور سربراہ قصی کو مکہ میں تمام مناصب حاصل ہوگئے۔لیکن وہ اس نظام سے مطمئن نہ تھا۔ وہ ایک انقلاب کا بانی بن گیا۔عدنان ابن اُدد کی وفات کے بعد قیداری سلطنت کے خاتمہ کے بعد قصی پہلا شخص تھا جس نے مکہ میں ازسرنو قیداری قریشی ریاست قائم کی۔بیشک ایک روایت ایسی ضرور پائی جاتی ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے دیگر بیٹوں کی طرح بنی قیدار نے بھی ایک بڑی سلطنت قائم کی تھی۔ بائبل اور عرب زبانی روایات میں بنی اسماعیلؑ کی حکومتوں کے حوالے تو موجود ہیں مگر ان کی سیاسی ہیئت واضح نہیں ہے کہ وہ بادشاہی تھیں یا قبائلی یا جاگیری نظام تھے۔تاریخ عالم اور ایام العرب اس قیداری

سلطنت کی تفصیلات پر بھی خاموش ہیں۔ اس کا ظاہری سبب یہ تھا کہ اس زمانہ میں عصری تاریخ کو مستقبل کے لیے محفوظ رکھنے والی شاعری کی روایت ابھی اتنی مستحکم نہیں ہوئی تھی کہ اس سے تاریخی واقعیت اخذ کی جاسکے۔ بنی خزاعہ نے تین سو سال حکومت کی مگر سیاسی نظام میں کوئی اصلاح یا تبدیلی نہ کرسکے۔ قصی نے کار حکومت ہاتھ میں لیتے ہی پہلا کام یہی کیا۔ وہ ایک انقلابی شخص تھا اور مکہ میں ایک بڑے انقلاب کا بانی ثابت ہوا۔ وہ انقلاب سیاسی بھی تھا اور فکری بھی جس کے نتیجہ میں آیندہ نسل میں اقتصادی انقلاب آیا۔

قصی نے حجابت کعبہ کی اہمیت کو گھٹائے بغیر مکہ کو ریاست کا درجہ دیا۔ یہ صرف نام کی تبدیلی کا جاہلانہ ڈھکوسلہ نہیں تھا۔ نام بدلنے سے تاریخ نہیں بدل جاتی۔ یہ ایک بہت معنی آفریں عمرانی عمل تھا جس نے حجاز کے بنی اسماعیلؑ اور دیگر حلیف قبائل میں اسلام کی نعمت کو قبول کرنے کی صلاحیت کو پروان چڑھایا تھا اور قریش کو نفسیاتی طور پر ایک عالمی، سیاسی، علمی، تہذیبی نظام قائم کرنے کے قابل بنادیا تھا۔

اس مقام پر ایک نکتہ پر نظر ٹھہرتی ہے۔ بظاہر قصی پہلا شخص تھا جس نے حجاج کو اللہ کا مہمان (ضیوف الرحمٰن) کہا اور فیصلہ کیا کہ اللہ کے ان مہمانوں کی مہمان نوازی اہل مکہ یعنی ریاست مکہ پر واجب ہے۔ اسی وجہ سے اس نے رفادہ کا شعبہ اپنی ریاست میں قائم کیا۔ ابن سعد (طبقات الکبریٰ ۱: ۷۲۔۷۳) اور بلاذری (کتاب جمل من انساب ۱: ۵۸) نے یہ وضاحت کی ہے۔ یہاں نکتہ یہ ہے کہ اگرچہ اس سے پہلے خزاعی دور تولیت میں بت پرستی پھیل چکی تھی گو کہ شرک کے باوجود مکہ کے عربوں نے اللہ کا انکار نہیں کیا تھا، پھر بھی قصی نے حج البیت کو صرف اللہ کی عبادت کا ذریعہ قرار دیا اور ہبل سمیت کسی ایک بھی بت سے اسے منسوب یا متعلق نہیں کیا تھا۔ اس وضاحت سے خود قصی کے مذہبی اعتقاد پر ایک کھڑکی کھلتی ہے۔ بعض روایات میں قصی کو دین اسماعیلؑ کا مومن اور موحد کہا گیا ہے، واللہ اعلم۔ قصی کے زمانہ سے پہلے خزاعی دور میں مکہ میں بت پرستی رواج پاچکی تھی۔ البتہ قصی سے سات پشت اوپر الیاس بن نزار بن معد بن عدنان کے متعلق ابن سعد کی روایت امام سہیلی (الروض الانف ۱: ۳۰) نے نقل کی ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنے جداعلیٰ کے متعلق فرمایا تھا:

لا تسبوا الیاس ، فانہ کان	الیاس کو برا نہ کہو، بے شک وہ مومن تھے۔ بلاشبہ
مؤمنا۔	اس زمانہ میں تمام بنی اسماعیلؑ اہل ایمان تھے۔

پروہتی طریقہ سے گریز: حجابت کعبہ اور منی وعرفات سے حجاج کے قافلوں کو روانگی کی اجازت دینا خالص مذہبی کام تھے۔ اقوام ماضی میں ایسے کام پروہتی نظام قائم کرنے کا سبب ہوتے تھے۔ مدون تاریخ گواہ ہے کہ انبیاء کو سب سے سخت مقابلہ اور دشمنی کا سامنا ان پروہتوں ہی سے ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی دشمنی میں یہی طبقہ پیش پیش تھا جو فریسی کہلاتا تھا۔ حضرت نوح، حضرت ادریس، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت شعیب علیہم السلام کو بھی اسی کاہن اور پروہتی طبقہ نے تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ قصی کا اپنا روحانی مقام نہیں تھا، مگر اس کی عمرانی فراست آزاد اور ذاتی نہیں تھی، بلکہ اطلاق ونتائج میں تقدیری اور ربانی حکمت کے تابع نظر آتی ہے۔

قصی نے حجابت کعبہ کا محکمہ تو ختم نہیں کیا لیکن اسے نظام ریاست کا ایک حصہ بنا دیا۔ ماضی میں بھی اس کا عرف انتظامی تھا۔ البتہ عمرو ابن لحی خزاعی نے اس محکمہ کے سربراہ کی حیثیت ہی سے مکہ میں بت پرستی کا آغاز کیا تھا۔ قصی کے نظام میں فرق یہ پڑا کہ حجابت کعبہ کو دوبارہ انتظامی شعبہ بنا دیا گیا اور اس شعبہ کا سربراہ کسی مندر یا ہیکل کا پروہت، پجاری اور کاہن کا منصب رکھنے والا نہیں تھا کہ شعبدہ بازی سے عام لوگوں کے دماغوں کو ماؤف کردے اور جو چاہے آرڈر دے اور لوگ اندھوں کی طرح اس کی پیروی کر لیں۔ چنانچہ مذہبی امور میں، خواہ ان کا تعلق بتوں کی پرستش ہی سے ہو، کعبہ کا کوئی بڑا پجاری یا پروہت کبھی نہیں تھا۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے زمانوں سے یہی صورت تھی۔ ریاست ایک سیاسی نظام تھی جس میں سربراہی خود قصی کی تھی۔ اور اس کی حیثیت پروہت کی نہیں تھی۔

یہ بات قابل توجہ ہے۔ قصی نے خود کو مذہبی پیشوا نہیں قرار دیا تھا حالانکہ کعبہ کے متولی کی حیثیت سے خود کو پروہت یا کاہن قرار دینے کا امکان اس کے سامنے کھلا تھا۔ یہی نہیں، نظام قصی میں قریش کے بنی سہم بن عمرو کو وزارت اموال محجرہ حاصل تھی جس کے ماتحت اس قبیلہ کے نمایندہ کو حرم میں رکھے ہوئے بتوں کے چڑھاوے اپنی تحویل میں رکھنے کا حق تھا۔ لیکن قصی نے اس شعبہ کو بھی انتظامی معاملات تک محدود رکھا اور اس شعبہ کے سربراہ کو کاہن یا پروہت کا درجہ نہیں دیا۔ اسی طرح وزارت ایسار ایک درجہ میں مذہبی نوعیت کا شعبہ تھا جس کے ماتحت بغیر پھل اور پر کے ازلام تیروں سے فال نکالنے کا نظام بھی بتوں کے ساتھ رائج تھا۔ یہ ذمہ داری بنی جمح کے پاس تھی اور اس کا وزیر امیہ بن خلف جیسا سخت دشمن اسلام تھا۔ تاہم امیہ بن خلف یا اس کے پیش روؤں کو بھی پروہت اور کاہن کا مقام

حاصل نہ تھا۔ امیہ بن خلف کی حیثیت محض پانسہ پھینکنے والے کی تھی، اپنے طور پر پیشین گوئی یا پانسہ کی مطلب سازی کرنے والے کی نہیں کیونکہ سوال کا جواب تیروں کے اوپر لکھا ہوتا تھا۔

خود قصی نے ریاست کے منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے اپنا لقب ''رئیس'' رکھا تھا، یعنی وہ صدر ریاست مکہ تھا۔ یہ ثبوت تھا کہ اس کا نظام اصل میں سیاسی تھا، اساسی طور پر اعتقادی نہیں تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شاید بت پرستی کے اثرات کو تدریجی طور پر زائل کرنے کے لیے قصی نے اپنے نظام میں معاشرتی سیاست کو اعتقادی معاملات پر ترجیح دی تھی جس کی بنا پر ارادتاً یا نیتجتاً اعتقادی فساد میں قدرے کمی آئی اور دو تین نسل بعد ورقہ بن نوفل اور زید الخیر جیسے افراد مکہ میں نظر آنے لگے۔ بے شک قصی نے اپنی بزرگی اور امتیاز کی دلیل اسی رئیس کے عہدہ کو بنایا اور اس کی پہچان یہ بنائی کہ شہر میں کعبہ کی سمت کھلنے والے مکانات کے تمام دروازے بند کروا دئے اور یہ حق خود اپنے لیے خاص رکھا کہ صرف اسی کے گھر کا دروازہ کعبہ کے رخ کھلتا تھا۔ اس دروازہ کی اعتقادی اہمیت بھی ہو سکتی تھی اگر اس گھر کو کعبہ کے بتوں کے سب سے بڑے پروہت یا کاہن کا گھر قرار دے دیا جاتا یا اس دروازہ کے اندر بنے ہوئے طاق میں مذہبی رسومات کی ادائیگی کا انتظام کیا جاتا۔ اس کے برعکس قصی نے اپنے گھر کی اس بیٹھک کو سیاسی اور معاشرتی اہمیت دے کر اسے ریاست کی مشورہ گاہ قرار دیا اور اس کا نام دارالندوہ (جلسہ گاہ) رکھا، جہاں معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور جنگی امور پر رائے مشورہ ہوتا تھا (شبلی نعمانی، سیرۃ النبیؐ ۱:۱۲۲)۔ اس مشاورتی ادارہ کی رکنیت کی شرط اول تو قریشی ہونا تھی اور شرط ثانی اس فرد کا صاحب عقل و فراست، ذکاوت و ادراک، امور میں ماہر، معاملہ فہم ہونا ضروری تھا۔ اور سب سے بڑی شرط یہ تھی کہ اس کی عمر ۴۰ سال ہونی چاہیے۔ یہ آخری شرط تاریخی طور پر نہایت اہم تھی کیونکہ اس عرف و عادت کا لحاظ رکھتے ہوئے رسول اللہؐ کے ربانی اور ملکوتی اعلان نبوت کو ۴۰ سال کی عمر تک موخر رکھا گیا تھا۔

دنیا کی سیاسی حالت: پانچویں صدی عیسوی میں سیاسی مشورہ کا کوئی ریاستی ادارہ دنیا میں کہیں بھی نہیں تھا، بلکہ درحقیقت دنیا میں بطور ذمہ دار ادارہ خود ریاست ہی نہیں تھی۔ ہر جگہ خودمختار بادشاہ بیٹھے تھے جن پر ریاست کی اصلاح کا اطلاق نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ سترہویں صدی میں فرانسیسی بادشاہ لوئی چہاردہم نے اعلان کر دیا کہ ریاست تو میں خود ہی ہوں (I'Etat, c'est moi)۔ قصی کے زمانہ میں قسطنطنیہ کی بازنطینی قیصریت اور فارس کی ساسانی کسرائیت دنیا کی دو بڑی اور باہم دست و گریباں

سلطنتیں تھیں۔ان کا مدار کسی شورائی ادارہ پر نہیں حکمراں قیصر یا کسریٰ کے ذاتی، ہنگامی، جذباتی فیصلوں پر تھا اور اسی وجہ سے ان دونوں سلطنتوں کی تاریخ میں متواتر اتار چڑھاؤ آتے رہتے تھے، لگاتار استحکام کی روایت نہیں پائی جاتی تھی۔ان کا سیاسی تواتر حالت جنگ کے استمرار سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

ان دو بڑی سیاسی ہیئتوں کے علاوہ بھی دنیا کے تمام علاقوں میں اسی نوعیت کے سیاسی نظام چل رہے تھے۔قصی سے صدیوں پہلے یونان کے شہر ایتھنز میں شہری جمہوریت کا تصور پیدا ہوا جس کا دائرہ نفاذ و اثر محدود تھا۔یہ نظام تادیر نہ چل سکا اور خود ایتھنز میں مختلف نظریات کی آویزش کے بعد دولت مند طبقہ نے شہری سیاست پر قبضہ کرلیا۔دوسری صدی قبل مسیح میں اس کی جداگانہ حیثیت ختم ہوگئی اور شہر کو رومی سلطنت نے جذب کرلیا۔ایتھنز اور اس کے علاوہ سپارٹا، کورنتھ، آرگوس وغیرہ شہری حکومتیں آپس میں برسرپیکار رہیں اور جمہوری بلکہ اشرافی نظام شاہی میں تبدیل ہوگیا۔اسی زمانہ میں گنگا جمنا کے دریابہ میں دیہاتوں میں پنچایتوں کا رواج تھا جو بنیادی طور پر دیہی عدلیہ تھی۔ان دیہاتی مجلسوں میں گاؤں کے انتظامی معاملات بھی زیر بحث آجاتے تھے۔اس قدیم زمانہ میں راجاؤں کا انتظامی ڈھانچہ دیہات تک موثر نہیں تھا اور گاؤں والوں کو اپنے عدلیاتی نیز داخلی، مالی، انتظامی اور معاشرتی معاملات خود ہی طے کرنے پڑتے تھے۔مسلم عہد حکومت (۱۲۰۷-۱۸۵۷ء) میں دیہاتوں کو زمینداروں اور صوبیداروں کے واسطوں سے راست مرکز سے جوڑ دیا گیا تو پنچایتی نظام کی اہمیت ختم ہوگئی تھی۔بہرحال اس نظام کی خوبی یہ تھی کہ ایک گاؤں کے لوگ باہمی مشاورت کرتے تھے اور عدل کا حصول آسان تھا۔

ان علاقائی سیاسی یا انتظامی تجربات کی خبر دوسروں تک نہیں پہنچتی تھی۔ ہر کلھیا کا گڑ الگ تھا۔لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کسی ایک خطہ کا تجربہ کسی دوسرے خطہ کے عمل کی اساس تھا۔جو کچھ ایتھنز میں عمل میں آیا وہ ایتھنز ہی میں انجام کو پہنچ گیا۔دریابہ و پنجاب کے اثرات جنوبی ایشیا سے باہر کہیں نہیں پہنچے۔قصی کا تجربہ بنی اسماعیل کی ذہانت وسیاست کا مظاہرہ تھا اور کسی پڑوسی حکومت یا ملک نے اس سے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بچپن سے جوانی تک شام جیسے ملک میں گزارنے والے قصی نے بھی کسی پڑوسی حکومت یا ملک سے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔یہ اس کے ابتکاری شعور کا ثبوت ہے۔

یہ عمرانی شعور تمام قریشی قبائل کی اجتماعی میراث تھا اور اس اعتبار سے رسول اللہؐ کی خاندانی میراث تھا کیونکہ لگاتار تین پشتوں سے یہی خاندان ریاست مکہ کا سربراہ تھا۔ قصی سے ابوسفیان بن حرب بن امیہ کے عہد تک یہ نظام ابتکاری ہونے کے باوجود محض ایک شہر اور چند متمدن قبائل اور چند اہل بادیہ کے معاملات میں محدود تھا۔ رسول اللہؐ نے اس انقلابی نظام میں انقلابی اصلاح کی تو اس میراث کو ایک عالمی تہذیب کا عنوان بنا دیا۔ اور یوں رسول اللہؐ کی برکت اور ذہانت سے ملت ابراہیمؑ اوج کمال کو پہنچ گئی اور اب یہی تمام عالم انسانی کی میراث حکمت ہے۔

قصی کی تنظیم ریاست: قصی کا نظام حکومت وفاقی طرز پر قائم تھا جس میں ۱۲ قریشی قبائل اقتدار میں شریک تھے۔ البتہ قصی نے امارہ، حجابہ، سقایہ، رفادہ، ندوہ اور لواء کو اپنی اولاد کے لیے خاص کر دیا تھا (ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ، ۱:۱۵۱)۔ وفاقی قبائل ریاست کے صوبہ نہیں بلکہ ایسی سیاسی اکائیاں تھے جو معاشرہ یا وفاق قبائل میں اپنے درجہ اور مقام کے مطابق انتظامی عہدوں کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔ یعنی اقتدار میں اشتراک کی نوعیت وزارتی انداز کی تھی۔ وزارتیں مختلف قریشی قبائل میں مستقل طور پر تقسیم شدہ تھیں اور ان عہدوں پر فائز افراد بدل جاتے تھے مگر انتظامی قبیلوں کی تبدیلی نہیں ہوتی تھی تاکہ کسی بھی قبیلہ کو اپنے معاشرتی درجہ یا انتظامی مرتبہ میں تخفیف کا اندیشہ ہو نہ شکایت۔

ممکن ہے اعتراض ہو کہ یہ نظام ایک بڑے قبیلہ کی شاخوں تک محدود تھا اور دیگر قبائل اس میں شریک نہیں تھے۔ عہد رواں کے سیاسی تناظر میں یہ اعتراض بے محل ہے کیونکہ برطانیہ کا سیاسی نظام اکیسویں صدی میں بھی ایک بے فیض بادشاہ یا ملکہ کو سر پر بٹھائے ہوئے ہے۔ مزید یہ کہ اقتصادی معاملات میں غطفان، ثقیف، ہوازن جیسے غیر مکی قبائل ہی نہیں فارس و روم، مصر و عراق کی سلطنتیں بھی مکہ کے سیاسی نظام سے مربوط کر دی گئی تھیں تو قصی کی ریاست مقفل ذہن کی پیداوار نہیں تھی۔

ریاست کا انتظام ۱۹ وزارتی شعبوں پر مشتمل تھا۔ انتظامی امور پانچ صیغوں میں تقسیم کیے گئے تھے اور ہر صیغے میں کئی وزارتیں کام کرتی تھیں۔ ہر وزارت کسی خاص قریشی قبیلے کو تفویض کی گئی تھی۔ تمام صیغوں میں اولیت امور کعبہ کو تھی جس کے ماتحت چار وزارتیں تھیں۔ کعبہ کے بعد اہم تر صیغہ امور حج و زیارت کا تھا جن کا انتظام چھ وزارتوں کو حاصل تھا۔ تیسرا صیغہ عدل اور معاشرتی امور کا تھا جس میں چار وزارتیں برسر کار تھیں۔ چوتھا صیغہ دفاع کا تھا جس کا انتظام تین وزارتوں کے سپرد تھا اور

آخری صیغہ امور خارجہ کا تھا جس میں فقط ایک وزارت تھی۔اس کا مطلب یہ کہ قصی کا نقطۂ ارتکاز ریاست کی داخلی فلاح تھا اور بیرونی تعلقات بھی اسی قومی فلاحی محور پر گردش کرتے تھے۔اس پہلو کی اہمیت کا بہتر ادراک علم سیاسیات کی تفصیل میں ہوسکتا ہے۔

ابن ہشام (سیرۃ النبیؐ)،ابن سعد (طبقات الکبریٰ)،ازرقی (اخبار مکہ)،ابن عبدالبر (عقدالفرید)،شبلی نعمانی (سیرۃ النبیؐ) نے ان وزارتوں کا ذکر کیا ہے،سید محمد میاں (سیرۃ مبارکہ) نے ان وزارتی شعبوں کی مکمل فہرست دی ہے۔اپنی فہرست میں سید محمد میاں نے عہد محمدیؐ کے وزراء کے نام دیے ہیں۔اس سے پہلے انہی قبیلوں کے دیگر افراد ان عہدوں پر فائز رہے تھے جن کے ناموں کا اضافہ جہاں ممکن ہوا کر دیا گیا۔تفصیل حسب ذیل ہے:

ریاست مکہ: رئیس مکہ: قصی بن کلاب بن مرہ۔عبدالدار بن قصی۔عبدمناف بن قصی۔ ہاشم بن عبدمناف۔مطلب بن عبدمناف۔عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف۔ابو طالب بن عبدالمطلب۔ابوسفیان بن حرب بن امیہ بن عبدشمس بن عبدمناف بن قصی۔

رئیس مکہ تمام شعبوں اور اداروں کا نگران اعلیٰ اور منتظم اعلیٰ ہوتا تھا۔دارالندوہ کے تمام سیاسی، انتظامی اور عدالتی اجلاسوں کی صدارت وہی کرتا تھا اور ان اجتماعات کے فیصلوں کے نفاذ کی نگرانی بھی اسی کی ذمہ داری تھی۔

آٹھ رئیس مکہ: تقریباً دوسوسال کی مدت میں آٹھ افراد رئیس مکہ کے عہدہ پر فائز رہے۔قصی کے بعد سب اس کی راست اولاد میں سے تھے۔قصی نے اپنا جانشین بڑے بیٹے عبدالدار کو مقرر کیا تھا۔مگر اس میں قصی کا بڑا بیٹا ہونے کے علاوہ اور کوئی لیاقت نہیں تھی۔اس کے زمانہ میں بدانتظامی رونما ہونے لگی تھی۔قصی کے دوسرے بیٹے مغیرہ عرف عبدمناف نے باپ کی سیاسی وراثت کی حفاظت کی خاطر سیادت کے لیے خدمت کا اصول پیش کیا (حامدالانصاری غازی،اسلام کا نظام حکومت ۱۷۸-۱۷۹)۔ قریشی قبائل میں عبدمناف کو بنی اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی،بنی زہرہ بن کلاب،بنی تیم بن مرہ اور بنی حارث بن فہر کی حمایت حاصل ہوئی اور عبدالدار کی حمایت میں بنی مخزوم بن یقظہ،بنی سہم،بنی جمح اور بنی عدی کھڑے ہوئے۔عبدمناف نے قریشی اکثریت کی حمایت سے خدمت کے شعبوں سقایہ اور رفادہ کے ساتھ رئیس مکہ کا عہدہ حاصل کرلیا۔اس انقلاب کے بعد آخری رئیس تک تمام افراد عبدمناف

ہی کے خاندان سے منتخب ہوئے۔ان میں عبد مناف کے دو بیٹے (ہاشم اور مطلب)، اور ہاشم کے بیٹے اور پوتے (عبدالمطلب اور ابوطالب) لگاتار رئیس ہوتے رہے۔

آخری رئیس مکہ بنی ہاشم کے بجائے بنی عبد شمس بن عبد مناف سے تھا۔اعلان رسالت کے بعد مشرکین نے بنی ہاشم کو ریاست کے انتظام سے خارج کر دیا تھا جیسا کہ شعب ابوطالب میں ان کی محصوری (۶۱۷ء) سے بھی ثابت ہوتا ہے۔بنی ہاشم میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب نے اسلام قبول کر لیا تھا اور حضرت عباس بن عبدالمطلب اگرچہ فتح مکہ تک باڑھ کی دوسری طرف ہی رہے مگر رسول اللہؐ سے بے حد محبت کرتے تھے اس لیے ابوطالب کے بعد مشرکین کی مقبوضہ ریاست ان دونوں کی سرداری کو قبول نہیں کر سکتی تھی۔عبدالمطلب کے دیگر بیٹوں میں ابوطالب اور زبیر کے علاوہ کسی اور نے قیادت کی اہلیت ظاہر نہ کی۔

عبدالمطلب کے بیٹے: عبدالمطلب کے بڑے بیٹے حارث کا انتقال باپ کی حیات ہی میں ہو گیا تھا، اس لیے عبدالمطلب کے بعد ریاست مکہ کی سربراہی ابوطالب (۵۴۰-۶۱۹ء) کو حاصل ہوئی۔ابوطالب کا اصل نام عبد مناف تھا۔ابوطالب کے ماں جائے بھائیوں میں دوسرے عبداللہ (۵۴۵-۵۷۱ء) اور تیسرے زبیر (۵۴۷-۵۹۵ء) تھے۔ابوطالب کے دور ریاست میں زبیر بن عبدالمطلب نے سقایہ اور رفادہ کی ذمہ داری لے لی تھی اور عبدالمطلب کے انتقال کے گیارہ سال بعد ۵۹۱ء میں بنی ہاشم، بنی تیم، بنی زہرہ وغیرہ کے تعاون سے حلف الفضول کے ماتحت مظلوموں کی دادرسی کا نظام بھی زبیر بن عبدالمطلب نے ہی قائم کیا تھا۔زبیر کا انتقال بعثت سے پندرہ سال پہلے ہو گیا تھا۔

عبدالمطلب کے بیٹوں میں ابولہب (۵۴۹-۶۲۴ء) عمر میں ابوطالب اور عبداللہ سے چھوٹا تھا مگر فتنہ میں بہت بڑا۔وہ ایک خزاعی عورت لبنیٰ بنت ہاجر کے بطن سے تھا۔اس کا اصل نام عبدالعزیٰ تھا جو ممکن ہے اس کی ماں نے رکھا ہو۔شرک اور بت پرستی پر اس کے شدید اور بے لچک اصرار کی شاید یہی وجہ ہو۔چونکہ سرخ و سفید تھا اس لیے ابولہب (شعلہ والا) کے لقب سے معروف ہوا اور اتفاق سے آخرت میں یہی شعلہ اس کا مقدر بن گیا۔وہ ایک مغلوب الغضب اور بے شعور شخص تھا اس لیے قریش میں اس کی عزت نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ نفسیاتی مریض ہو گیا تھا اور غالباً اسی لیے اپنے سے ۲۲ سال چھوٹے بھتیجے رسول اللہؐ کی مخالفت اور لاعلاج دشمنی میں ابوجہل کی غیر مشروط حمایت کر کے مکہ کے معاشرہ

میں وہ عبدالمطلب کے بعد کوئی مقام بنانے کا خواہش مند تھا مگر اس کے باوجود ریاست یا معاشرہ میں اسے کوئی منہ نہیں لگاتا تھا۔ ابوجہل نے اس کا استحصال کیا ہوگا کیونکہ وہ بھی بنی عبدمناف کی سرداری کو اپنے قبیلے بنی مخزوم کی طرف منتقل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا اور رسول اللہؐ کے اعلان توحید کی شدید مخالفت میں اسے اپنی بدخوابی پر یقین بڑھ رہا تھا۔ ادھر خود بنی عبدمناف میں عتبہ بن ربیعہ اور ابوسفیان بن حرب جیسے بزرگ لوگ بھی اس کے پھیرے میں آ چکے تھے تو ابولہب کی تو اوقات کیا تھی۔

عبدالمطلب کے دیگر پانچ بیٹوں، مصعب، الغیداق عرف حجل، عبدالکعبہ عرف مقوم، مغیرہ اور ضرار نے یا تو کسی قابلیت کا مظاہرہ نہیں کیا یا وہ بنی ہاشم کے مقاطعہ کا شکار ہو گئے تھے۔ ان میں سے کسی نے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور نہ ہی اسلام کے خلاف کسی مہم میں حصہ لیا۔ ان کی اولادوں نے البتہ اسلام قبول کر لیا تھا جن میں امتیازی شان حضرت عبیدہؓ بن حارث بن عبدالمطلب کی تھی جو غزوۂ بدر کے پہلے شہید تھے۔ عبدالمطلب کے اکثر بیٹوں کے سنین ولادت و وفات کا پتہ نہیں لگتا اور نہ ہی ان کی زندگی یا کاموں کے متعلق کوئی تاریخی روایت محفوظ کی گئی ہے۔

ریاست مکہ کی کابینہ: بانیِ ریاست مکہ قصی بن کلاب نے انتظامی امور کو کئی صیغوں اور شعبوں میں تقسیم کر کے ہر شعبہ کی وزارت قائم کر دی تھی۔ اس کی ''کابینہ'' انیس وزارتوں پر مشتمل تھی۔ یہ وزارتیں دس قبائل کو تفویض کی گئی تھیں۔ البتہ بنی زہرہ (ابن کلاب، ابن مرہ)، بنی حارث بن فہر، بنی عمرو (ابن لوی، ابن غالب/سہیل بن عمرو) کو کوئی وزارتی ذمہ داری نہیں دی گئی تھی۔ قصی انتظامیہ یا کابینہ کے شعبوں، ان کے منتظم قبائل اور وزراء کی تفصیل حسب ذیل ہے:

صیغہ امور کعبہ: ا۔ وزارت حجابہ و سدانہ۔ قبیلہ بنی عثمان بن عبدالدار بن قصی۔ وزیر: (حضرت) عثمان (۵۹۸-۶۵۱ء) بن طلحہ بن ابوطلحہ عبداللہ بن عبدالعزیٰ بن عبدالدار۔ وزیر عہد محمدی: شیبہ بن عثمان بن طلحہ۔

یہ خانہ کعبہ کی غلاف پوشی (حجابہ) اور کلید برداری (سدانہ) کا منصب تھا۔ بیت اللہ کی چابی اس وزیر کے پاس رہتی تھی اور وہی اس کا دروازہ کھولتا اور بند کرتا اور لوگوں کو بیت اللہ میں داخلہ کی اجازت دیتا تھا۔ رسول اللہؐ نے دائمی طور پر یہ منصب بنی شیبہ بن عثمان بن طلحہ کو دے دیا تھا۔ قصی کی ریاست کا یہ واحد شعبہ ہے جو آج تک برقرار ہے۔ باقی تمام شعبہ معدوم ہو چکے ہیں۔ عہد رواں میں شیخ عبدالقادر شیبی

اپنے خاندان کے ۱۰۸ویں شخص اس عہدہ پر فائز ہیں۔

۲۔ وزارت عمارہ: قبیلہ بنی عثمان بن عبدالدار بن قصی۔ وزیر: عثمان بن طلحہ۔شیبہ بن عثمان بن طلحہ۔حرم کعبہ کا عام انتظام اور نگرانی اس شعبہ کے وزیر کی ذمہ داری تھی۔

۳۔وزارت ایسار: قبیلہ بنی جمح۔وزیر: امیہ بن خلف (م: ۶۲۴ء/غزوۂ بدر)۔صفوان بن امیہ بن خلف۔پانسہ کے تیر (ازلام) پھینک کر فال نکالنے کی ذمہ داری جس کا قاعدہ مقرر تھا۔

۴۔وزارت اموال محجرّہ: قبیلہ بنی سہم۔وزیر: العاص بن وائل (م: ۶۲۰ء)۔وزیر عہد محمدی: (حضرت) عمرو (۵۸۵۔ ۶۶۴ء) بن العاص بن وائل۔حارث بن قیس۔

بتوں پر چڑھائے جانے والے نذرانوں کی حفاظت اور ان کا انتظام، چونکہ بت عام طور سے پتھروں کے ہوتے تھے اس لیے ان کے چڑھاوؤں کو اموال ممنوعہ یا مقدس مال کہتے تھے۔ریاستی آمدنی کا یہی واحد ذریعہ تھا اور اسی کو ریاست کی وزارت مال کہا جاسکتا تھا۔قصی کی ریاست مکہ میں عام لوگوں پر کوئی ٹیکس نہیں تھا جس سے ریاست کی آمدنی ہوتی۔ریاستی اخراجات اور دیگر مالی امور بھی ان کی متعلقہ وزارتوں اور وزیروں کے ذمہ ہوتے تھے۔قصی کی تیسری نسل میں اقتصادی امور کو اہمیت حاصل ہوئی لیکن اس مقصد کے لیے کوئی مستقل وزارت قائم نہیں کی گئی اور وہ راست رئیس مکہ کی ذمہ داری تھی۔

صیغہ حج وضروریات حجاج: ۵۔وزارت سقایہ۔قبیلہ عبدالدار۔بنی عبدمناف۔بنی ہاشم بن عبدمناف۔ وزیر: عبدالدار بن قصی۔عبدمناف بن قصی۔ہاشم بن عبدمناف (۴۶۴۔۴۹۷ء)۔ مطلب بن عبدمناف (م: ۵۱۰ء)۔ وزیر عہد محمدی: عبدالمطلب (۴۹۷۔۵۷۹ء) بن ہاشم۔ زبیر (۵۴۷۔۵۹۵ء) بن عبدالمطلب۔ابوطالب (۵۴۰۔۶۱۹ء) بن عبدالمطلب۔طالب بن ابوطالب۔

حاجیوں کے لیے پانی کا انتظام کرنا۔دوبارہ کھدائی میں زمزم کے برآمد ہونے سے پہلے حرم میں چمڑے کے حوض رکھ دیے جاتے تھے اور اطراف کے کنوؤں کے پانی سے انہیں بھرا جاتا رہتا تھا۔ بعد میں زمزم کا انتظام اسی شعبہ کے ماتحت تھا۔اس وقت چمڑے کے حوضوں کا نظام ختم کر دیا گیا تھا۔

۶۔وزارت رفادہ: قبیلہ: عبدالدار بن قصی۔ بنی عبدمناف بن قصی۔ بنی ہاشم بن قصی۔ وزیر: عبدالدار بن قصی۔عبدمناف بن قصی۔نوفل بن عبدمناف۔ہاشم بن عبدمناف۔مطلب بن عبدمناف۔وزیر عہد محمدی: عبدالمطلب بن ہاشم۔زبیر بن عبدالمطلب۔ابوطالب بن عبدالمطلب۔

عبد مناف کے بعد پہلے یہ شعبہ بنی نوفل بن عبد مناف کے پاس تھا۔ ہاشم بن عبد مناف نے خشک سالی کے وقت قصی کے اجتماعی اصول کے مطابق قریش کو جمع کر کے اس مد میں سب سے چندہ وصول کیا اور اس سے شوربہ میں روٹی چور کر حجاج کے کھانے کا انتظام کیا گیا۔ یہ پہلا ٹیکس تھا جو قصی نے ریاست مکہ میں صرف قریش پر لگایا تھا۔ تمام غیر قریشی قبیلے اس ٹیکس سے مستثنیٰ اور خود قریش کو بھی اس کے علاوہ کوئی اور ٹیکس نہیں دینا پڑتا تھا۔

۷۔ وزارت افاضہ یا وزارت اجازہ۔ قبیلہ بنی صوفہ۔ بنی صفوان۔ وزیر: الغوث بن مر (بنی صوفہ)۔ وزیر عہد محمدی: کرب بن صفوان (بنی صفوان)۔

حج کے دوران عرفات سے حجاج کی منیٰ واپسی بڑے منظم اور مہذب انداز سے ہوتی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ جس کا جی چاہے عرفات سے مزدلفہ کے لیے دوڑ لگا دے۔ انتشار اور بدامنی سے بچنے کے لیے مستقل انتظام کیا گیا تھا۔ وزارت افاضہ یا وزارت اجازہ پر مامور قبیلہ کے کارکن اور رضا کار مختلف علاقوں اور قبیلوں کے حجاج کو یکے بعد دیگرے ترتیب وار روانگی کی اجازت دیتے تھے۔ بنی جرہم اور بنی خزاعہ کے زمانہ سے اس کام پر بنی صوفہ متعین تھے۔ یہ ایک مضری اسماعیلی قبیلہ تھا۔ ابن ہشام نے اس کا نسب الغوث بن مرہ بن ادد بن طابخہ بن الیاس بن مضر بیان کیا ہے رسول اللہ کا نسب طابخہ کے بھائی مدرکہ بن الیاس کے عمود میں ہے۔ الغوث کی ماں ایک جرہمی عورت تھی۔ اس کے اولاد نہ ہوتی تھی تو اس نے اللہ سے نذر مانی کہ بیٹا ہوا تو اسے کعبہ کی خدمت کے لیے وقف کر دے گی۔ الغوث اس کا بیٹا تھا۔ ابتدا میں الغوث اپنے جرہمی ماموؤں کے ساتھ انتظام کعبہ میں لگا رہتا تھا۔ اس کی قابلیت دیکھ کر عرفات سے حجاج کی روانگی کی اجازت دینے کا کام اس کے سپرد ہو گیا۔ بنی صوفہ ہی منیٰ سے عرفات جانے اور آخری رمی جمار کے بعد منیٰ سے مکہ واپس جانے کی اجازت بھی دیتے تھے۔ زوال شمس کے بعد آخری رمی جمار سب سے پہلے بنی صوفہ کے لوگ کرتے تھے اس کے بعد ہی کسی دوسرے قبیلہ کے لوگ رمی کر سکتے تھے۔ پھر سب سے پہلے بنی صوفہ کے لوگ منیٰ سے مکہ جاتے۔ ان کے نکلنے کے بعد ہی کسی دوسرے قبیلہ کے لوگ رمی جمار سے فارغ ہو کر مکہ جا سکتے تھے۔ بنی صوفہ عدنانی قبیلہ تھا، قریشی قبیلہ نہیں تھا۔ قصی نے اسے معزول کر دیا اور قبیلہ تتر بتر ہو گیا۔ قصی نے اس وزارت پر بنی صفوان کو متعین کر دیا جو بنی صوفہ کے جدی رشتہ دار بنی سعد میں آل صفوان بن خباب بن شجنہ بن عطارد بن عوف بن کعب بن

سعد بن زید مناۃ بن تمیم تھے۔

۸۔ وزارت وِقادہ۔ قبیلہ بنی عبد مناف (بنی ہاشم، بنی مطلب، بنی نوفل، بنی عبد شمس/ امیہ)۔ وزیر: ابوطالب ابن عبد المطلب/ بنی ہاشم۔

حج کے دوران عرفات سے واپس منیٰ آتے ہوئے رات کو مزدلفہ میں کھلے آسمان تلے قیام کیا جاتا ہے۔ مزدلفہ میں نہ کوئی عمارت ہے اور نہ روشنی کا انتظام۔ قصی نے خاص اس کام کے لیے ایک خصوصی وزارت قائم کردی جس کے ذمہ مزدلفہ میں مشعلیں اور پہاڑوں پر آگ جلا کر روشنی کرنا تھا۔ وقد آگ جلانے کو کہتے ہیں۔

۹۔ وزارت نَسی۔ قبیلہ بنی صوفہ۔ بنی صفوان۔ وزیر: ابوثمامہ جنادہ بن عوف۔

عہد جاہلیت عربوں میں سال کے مہینوں اور دنوں میں تبدیلی قمری سال کو شمسی سال کے برابر کرنے کی وجہ سے نہیں تھی۔ مکہ میں زراعت نہیں ہوتی تھی اور نہ وہاں عام طور سے برسات کا موسم آتا ہے کہ فصلوں کی خاطر مہینے بڑھائے گھٹائے جائیں۔ اصل میں جاہلی عربوں کو جنگوں کی وجہ سے یہ کام کرنا پڑتا تھا۔

نامعلوم زمانہ سے عربوں میں سال کے چار ماہ محترم مانے جاتے تھے یعنی ان مہینوں میں جنگ وجدال اور بدو قبائل کی لوٹ مار نہیں ہوسکتی تھی۔ ان چار میں تین مہینے ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم لگاتار تھے اور رجب کا مہینہ درمیان سال میں پڑتا تھا۔ ذی القعدہ سے محرم تک کا زمانہ حرام مہینوں کا مقرر تھا کیونکہ ان مہینوں میں قریب ودور سے حجاج مکہ آتے تھے اور حج سے فارغ ہوکر واپسی کا سفر کرتے تھے۔ چنانچہ حج کی وجہ سے قبائل میں فوجی نفری کی خاصی بڑی کمی ہوجاتی تھی اور یہ بھی اس مدت میں جنگ نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ تھی۔ اس کے علاوہ حجاج کے قافلوں کو بھی امن درکار ہوتا تھا۔ مگر جن قبائل کی زندگی انحصار قافلوں کی لوٹ مار پر تھا ان کے لیے یہ تین ماہ پریشانی کے ہوتے تھے۔ اس لیے مہینوں کو آگے پیچھے کردیا جاتا تھا۔ یعنی اعلان ہوجاتا کہ ذی الحجہ کے بعد صفر پہلے آئے گا اور محرم اس کے بعد۔ اس سسٹم کو نسی کہتے تھے۔ بدلے جانے والے مہینہ کو عربی میں کبیسہ کہتے تھے، ہندی میں اسے لوند کا مہینہ کہتے ہیں۔ کبیسہ کا انتخاب اور اعلان کی ذمہ داری بنی صوفہ کو حاصل تھی۔ بعد میں بنی صفوان کو دے دی گئی تھی۔ اسلام نے اس طریقہ اور وزارت کو ختم کردیا تھا۔

۱۰۔وزارت قُبَّہ۔ یہ وزارت قریش کے کسی قبیلہ کے سپرد کردی جاتی تھی۔

حج اور جنگ کے موقع پر حجاج اور فوجوں کی خیمہ گاہوں اور خرگاہوں کا انتظام اس وزارت کے سپرد تھا۔حاصل شدہ معلومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا کوئی مستقل وزیر نہیں تھا اور مختلف موقع پر مختلف قبائل کو یہ ذمہ داری سونپی جاتی تھی، اس طرح یہ شعبہ بظاہر رئیس مکہ کے پاس تھا اور اس کی صواب دید پر کسی قبیلہ کو اس کا ذمہ دار بنایا جاتا تھا۔

صیغہ عدل واجتماعی امور: ۱۱۔وزارت الندوہ: قبیلہ بنی عبدالدار بن قصی۔وزیر عہد محمدی: عثمان بن طلحہ (ابن ابوطلحہ عبداللہ بن عبدالعزی بن عبدالدار بن قصی)۔

جوار کعبہ میں تعمیر ہونے والا قریش کا پہلا مکان یہی تھا۔اسے قصی بن کلاب نے تعمیر کیا تھا۔ اس کی بیٹھک کو مرکز ریاست قرار دیا گیا تھا اور تمام سرکاری امور پر بحث ومشورہ کے لیے اس کا نام دارالندوہ رکھا گیا تھا۔احمد بن یحییٰ بلاذری کا بیان ہے کہ نظام حکومت سے پہلے قریش اس گھر میں جمع ہوتے اور جنگوں اور دیگر عمومی معاملات کے اجتماعی فیصلے کرتے تھے۔اسی میں نکاح پڑھائے جاتے تھے (فتوح البلدان (انگ: فلپ حتی) ۱: ۸۰ / ع: ۵۳)۔دارالندوہ قریش کی عدالت عالیہ بھی تھا۔ الندوہ میں مقدمات کی سماعت ہوتی تھی، اگرچہ اس مقصد کے لیے مستقل وزارت حکومہ قائم تھی۔قریشی بچیاں بالغ ہوجاتیں تو ان کا لباس بھی دارالندوہ میں تبدیل کیا جاتا تھا۔ایک تقریب میں یہ رسم درع (سینہ بند) دارالندوہ میں ادا کی جاتی تھی۔ٹھیٹھ اردو میں دارالندوہ کا ترجمہ چوپال ہوسکتا ہے، مگر چوپال میں عام مجلس ہوتی ہے جس میں بلا روک ٹوک کوئی بھی آسکتا ہے۔دارالندوہ کی رکنیت کی شرائط سخت تھیں۔اول یہ کہ نامزد شخص کے عقل وشعور اور سیاسی تدبر اور معاشرتی تجربہ کا عام اعتراف کیا جاتا ہو۔ دوسرے یہ کہ عرب روایت کے مطابق فرد میں یہ صلاحیتیں چالیس سال کی عمر میں پیدا ہوتی ہیں لہٰذا دارالندوہ کی رکنیت کے لیے چالیس سال عمر ہونا ضروری تھی۔اس شرط کو تاریخ میں صرف دو بار عمرو بن ہشام اور حکیم بن حزام کے معاملہ میں نرم کیا گیا تھا، جنہیں وقت سے پہلے ہی دارالندوہ میں بیٹھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔عمرو بن ہشام کی عقل مندی کے اعتراف میں قریشی معاشرہ نے اسے ابوالحکم کا لقب دیا تھا، جو بعد میں انکار حق میں انتہا پسندی کی بنا پر ابوجہل میں بدل گیا تھا۔حکیم بن حزام بن خویلد اسدی (۵۶۶-۶۷۴ء) کی دانش مندی کا اعتراف خود رسول اللہؐ نے کیا تھا۔انہوں نے فتح مکہ کے وقت

اسلام قبول کیا تھا۔اس موقع پر رسول اللہؐ نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے ان سے کہا تھا کہ تعجب ہے ان جیسے ذہین و متین شخص نے اسلام میں سبقت کیوں نہیں کی۔ وہ ام المومنین حضرت خدیجہؓ بنت خویلد کے بھتیجے تھے۔

۱۲۔وزارت مشورہ: (جدید برطانوی اصطلاح میں وزارت پارلیمانی امور)۔قبیلہ بنی اسد (ابن عبدالعزیٰ بن قصی بن کلاب بن مرہ)۔وزیر: (حضرت) یزید بن زمعہ (ابن اسود بن مطلب بن اسد بن عبدالعزی)۔

تمام اہم قومی، قبائلی، سیاسی، فوجی امور پر گفتگو دارالندوہ میں ہوتی تھی۔ جب ایسی ضرورت پیش آتی تو اجلاس کا انتظام کرنے کی ذمہ داری ایک مستقل وزارت کے سپرد تھی جو تمام شیوخ قبائل اور اراکین دارالندوہ کو بحث طلب امور اور اجلاس کے دن اور وقت وغیرہ کی اطلاع دیتی تھی۔جدید برطانوی پارلیمانی اصطلاح میں اسے وزارت پارلیمانی امور بھی کہا جا سکتا ہے اور پارلیمانی سکریٹیریٹ بھی۔

۱۳۔وزارت اشناق: قبیلہ بنی تیم۔وزیر: ابی قحافہ عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن مرہ بن کعب۔وزیر عہد محمدی: (حضرت) ابوبکر بن ابی قحافہ عثمان۔

قتل عمد یا قتل خطا کے معاملات میں خوں بہا یا دیت، جرمانہ اور مالی تاوان کا فیصلہ کرنا اس وزارت کی ذمہ داری تھی۔صرف یہی نہیں بلکہ دیت کی ادائیگی یا قصاص پر عمل درآمد یہی وزارت کرواتی تھی۔اس وزارت کا کام نہایت پیچیدہ تھا۔اسے کم و بیش تمام عرب قبائل سے واسطہ پڑتا رہتا تھا اس لیے اس شعبہ کے وزیر کا ماہر انساب ہونا نہایت ضروری تھا۔ چونکہ بین القبائل روابط شعر میں محفوظ کیے جاتے تھے، اس لیے وزیر اشناق کو فن شاعری میں طاق اور اس فن کا نقاد ہونا بھی ضروری تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مناقب میں یہ دونوں خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔

۱۴۔وزارت حکومت: (جدید اصطلاح میں وزارت عدل/ امریکہ میں اٹرنی جنرل کی وزارت)۔قبیلہ بنی سہم بن عمرو بن ہصیص بن کعب بن لوی۔وزیر عہد محمدی: عاص (م: ۶۲۰ء) بن وائل بن ہاشم بن سعد بن سہم بن عمرو بن ہصیص بن کعب بن لوی۔وزیر عہد محمدی: حارث بن قیس بن عدی بن سعد بن سہم/کنیت ابن الغیطلہ۔

اس وزارت کا کام جرائم کے مقدمات کی سماعت اور عدالتی فیصلہ کا انتظام کرنا تھا۔دارالندوہ

میں جس طرح سیاسی یا انتظامی امو پر اجلاس کا انتظام کرنے کے لیے مستقل وزارت مشورہ تھی، اسی طرح عدالتی امور کے لیے جلسوں کے انعقاد کا انتظام کرنے والی مستقل وزارت کو حکومت کہا جاتا تھا۔ اردو میں حکومت کا لفظ سیاسی انتظامی ہیکل کے لیے بولا جاتا ہے، مگر نظام قصی میں اس وزارت کی ذمہ داری عدل قائم کرنا تھی اور عدل قائم کرنے کے نظام کو عربی زبان میں حکومت کہا جاتا ہے۔ عربی میں منصف، جج یا قاضی کو حکم کہتے ہیں، عدالت کو محکمہ کہا جاتا ہے اور وہ جسے اردو میں مقدمہ کہتے ہیں عربی میں اسے محاکمہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ حکم کا لغوی مطلب عدالتی فیصلہ ہوتا ہے۔ سرکاری فرمان کو بھی اسی لیے حکم کہا جاتا ہے کہ وہ عدل پر مبنی ہوتا ہے، کسی ایک فریق کی اندھی یا ارادی طرف داری پر نہیں۔ دارالندوہ میں عدالت کا اجلاس ہوتا تھا۔ ان اجلاسوں کے انتظامات کے لیے قصی نے یہ ایک مستقل وزارت قائم کردی تھی۔ اس وزات کا سربراہ اور قبیلہ مقدمات کی سماعت کے بعد مجرموں کو سزا اور دیگر عدالتی فیصلوں کے نفاذ کا ذمہ دار تھا۔

صیغہ جنگ: ۱۵۔ وزارت قیادت (قائد عساکر/ سپہ سالار)۔ قبیلہ بنی امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی۔ وزیر غزوہ بدر میں: عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس بن عبد مناف۔ وزیر غزوہ احد و خندق میں: ابوسفیان بن حرب بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف۔

قریش کی جنگوں میں سپہ سالار کا منصب قیادت کہلاتا تھا۔ یہ شعبہ بنی عبد مناف بن قصی میں بنی عبد شمس کو حاصل تھا۔ عہد محمدی میں بنی عبد شمس کے ذیلی قبیلہ بنی امیہ کا سردار قریشی سپہ سالار ہوتا تھا۔

۱۶۔ وزارت اَعِنَّہ۔ قبیلہ: بنی مخزوم بن یقظہ (برادر کلاب) بن مرہ بن کعب۔ وزیر: غزوۂ بدر میں (ابوجہل) عمرو بن ہشام بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم بن یقظہ (برادر کلاب) بن مرہ بن کعب۔ وزیر: غزوہ احد میں خالد (۵۸۵-۶۴۲ء) ابن الولید بن مغیرہ مخزومی/ عکرمہ (ش: ۶۳۶ء) بن عمرو بن ہشام بن مغیرہ مخزومی۔ گھوڑسوار رسالہ (cavalry) کی سالاری کا عہدہ تھا جو بنی مخزوم کو حاصل تھا۔

۱۷۔ وزارت لواء۔ قبیلہ: بنی عبدالدار بن قصی۔ غزوۂ بدر میں قریشی علم بردار کا نام نہیں مل سکا، غالباً (حضرت) عثمان بن طلحہ (ابن ابوطلحہ عبداللہ بن عبدالعزی بن عبدالدار بن قصی) تھے۔

غزوۂ احد میں قریشی علم بردار: (نو افراد سب مقتول ہوئے) طلحہ بن ابوطلحہ، شیبہ بن ابوطلحہ، ابوسعد بن ابوطلحہ، عثمان بن ابوطلحہ، مسافع بن طلحہ، کلاب بن طلحہ، شریح فارظہ، صواب حبشی غلام عبدالدار۔

غزوۂ بدر میں اسلامی علم بردار: حضرت مصعب (۵۹۴-۶۲۵ء) بن عمیر بن ہاشم بن عبدمناف بن عبدالدار بن قصی ۔غزوۂ احد میں اسلامی علم بردار: مصعب بن عمیر عبدری، علی بن ابوطالب ہاشمی۔

نظام قصی کے ماتحت جنگ میں قریش کی علم برداری کا منصب بنی عبدالدار بن قصی کو حاصل تھا۔عربی میں جنگی پھریرے یا پرچم کو لواء کہا جاتا تھا۔دوران جنگ اس پرچم کی بڑی اہمیت تھی کیونکہ ایک فریق کی تمام فوج اس پرچم کے گرد ہی لڑتی تھی ۔علم بردار کی موت کے ساتھ اگر پرچم گرجاتا تو عموماً شکست ہوجاتی تھی، اس لیے علم بردار قتل ہوجاتا تو فوراً قبیلہ کا کوئی دوسرا شخص بڑھ کر علم تھام لیتا تھا، جیسا کہ غزوۂ احد کے دوران مشرکین کی علم برداری میں پیش آیا تھا۔

۱۸۔وزارت عقاب۔قبیلہ: بنی امیہ بن عبدشمس بن عبدمناف ۔وزیر: عتبہ (ت: ۵۶۳-۶۲۴ء) بن ربیعہ بن عبدشمس۔ابوسفیان صخر (۵۸۰-۶۴۰ء) بن حرب بن امیہ بن عبدشمس۔

عقاب قریش کے جھنڈے کا نام تھا۔یہ بنی عبدشمس بن عبدمناف کی شاخ بنی امیہ کی تحویل میں رہتا تھا۔ جنگ کے موقع پر اسے نکالا جاتا تھا اور بنی عبدالدار بن قصی کے کسی فرد کے ہاتھ میں دے دیا جاتا تھا جو وزارت لواء کے سربراہ تھے۔بدر کے موقع پر یہی جھنڈا اٹھانے پر عتبہ بن ربیعہ اور ابوجہل کے مابین تلخ کلامی اور دشنام طرازی ہوئی تھی۔

صیغہ خارجہ وصلح وامن: ۱۹۔وزارت سفارۃ۔قبیلہ: بنی عدی بن لوی۔وزیر: عبداللہ بن ریاح، عبدالعزیٰ بن عبداللہ، نفیل بن عبدالعزیٰ بن عبداللہ بن ریاح بن عبداللہ بن قرہ بن رَزہ بن عدی بن لوی۔وزیر عہد محمدی: خطاب (و۔ت: ۵۶۰ء) بن نفیل بن عبدالعزیٰ۔ (حضرت) عمر (۵۷۷-۶۴۴ء) بن الخطاب بن نفیل۔

دوسرے ملک یا دوسرے فریق جنگ سے جنگ یا صلح اور امن کی بات چیت اور ریاست مکہ کی جانب سے پیغام رسانی کی ذمہ داری اس وزارت کے سپرد تھی۔اسلام کے ابتدائی دور کا ایک اہم تاریخی واقعہ بلاتبصرہ نقل کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی ہجرت حبشہ کے بعد انہیں نجاشی کے ملک سے واپس لانے کی ذمہ داری بنی عدی کے کسی فرد کے بجائے بنی سہم کے عمرو بن العاص بن وائل کے سپرد کی گئی تھی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت سعید بن زید بن نفیل اور حضرت عمر بن الخطاب بن نفیل کے قبول اسلام

کے بعد اس وزارت کی سربراہی کے لیے بنی عدی میں کوئی مناسب شخص نہیں رہ گیا تھا اور وزارت سفارت میں وزیر کا منصب خالی ہو گیا تھا۔ چنانچہ سفارہ کی ذمہ داری وزارت حکومت کے قبیلہ بنی سہم کے ممتاز فرد عمرو بن العاص اور ان کے ردیف کے طور پر عبداللہ بن ربیعہ کو دی گئی تھی۔

کتابیات

ابن اسحاق، السیرۃ النبویہ، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۴ء۔

ابن ہشام، سیرۃ النبی (ار۔تر: عبدالجلیل صدیقی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، سنہ ندارد۔

ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، جلد سیرۃ النبی: جلد اول (ار)، مکتبہ قدوسیہ، لاہور ۱۹۹۶ء۔

ابن المبرد، جمال الدین یوسف مقدسی، الشجرۃ النبویہ، المنتدی الاسلامی، حکومت الشارقہ، سنہ ندارد۔

ابوالنصر، عمر، سیدالعرب (ار۔تر: شیخ محمد احمد پانی پتی)، میر اینڈ کمپنی، دہلی، ۱۹۶۳ء۔

تھانوی، اشرف علی، نشر الطیب فی ذکر الحبیب، مشتاق بک کارنر، لاہور، ۲۰۰۳ء۔

السہیلی، عبدالرحمٰن، الروض الانف، جلد اول، دارالکتب العلمیہ، بیروت، سنہ ندارد۔

گابا، خالد لطیف، دی ڈیزرٹ پروفیٹ، آدم پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز دہلی۔

منصور پوری، قاضی محمد سلیمان، رحمۃ للعالمین، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، سنہ ندارد۔

میاں، سید محمد، سیرۃ مبارکہ، کتابستان دہلی، ۱۹۷۳ء۔

نعمانی، شبلی، سیرۃ النبی (جلد اول)، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۲۰۰۲ء۔

ولی اللہ، شاہ، سیرۃ الرسول (ار۔تر: خلیفہ محمد عاقل)، دارالاشاعت کراچی، ۲۰۱۴ء۔

ہیکل، محمد حسین، دی لائف آف محمد (انگ۔تر: اسماعیل راجی فاروقی)، شروق انٹرنیشنل لندن، ۱۹۸۳ء۔

ابن سعد، طبقات الکبیر، مکتبہ خانجی قاہرہ، ۲۰۰۱ء۔

ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، المطبعہ منیریہ قاہرہ، ۱۳۴۵ھ۔

ازرقی محمد ابن عبداللہ (م: ۸۵۸ء)، اخبار مکہ، خیات بیروت، ۱۹۶۴ء۔

ابن عبدالبر، احمد ابن محمد، العقد الفرید، دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۸۳ء۔

احمد، ضیاء الدین، ''مکہ مکرمہ اسلام سے پہلے'' (مقالہ)، ششماہی الایام، مجلس برائے تحقیق اسلامی تاریخ و ثقافت، کراچی، جولائی۔دسمبر ۲۰۱۲ء۔

الخیاری، محمد احمد یاسین، مختصر انساب، مطابع الایوبی جدہ، ۱۹۸۷ء۔

الشریف، احمد ابراہیم، مکہ والمدینہ فی الجاہلیہ وعہد الرسول، قاہرہ، ۱۳۵۳ھ۔

باسلامہ، حسین عبداللہ، تاریخ الکعبہ المعظمہ، مکتبہ تہامہ، جدہ، ۱۹۸۲ء۔

بلاذری، احمد ابن یحییٰ، فتوح البلدان (انگ۔تر: فلپ حتی، دی اوریجنس آف دی اسلامک اسٹیٹ) جلد اول، کولمبیا یونیورسٹی نیویارک/لونگمنس، گرین اینڈ کو، لندن، ۱۹۱۶ء۔

بلاذری، احمد ابن یحییٰ، کتب جمل من انساب، دارالفکر، بیروت، ۱۹۹۶ء۔

حمیداللہ، محمد، احابیش قبائل ''کفار مکہ کے حلیف'' (مقالہ) ششماہی الایام، مجلس برائے تحقیق اسلامی تاریخ و ثقافت، کراچی، جولائی۔دسمبر ۲۰۱۲ء۔

طبری، ابن جریر، تاریخ الرسل والملوک (جلد اول)، نفیس اکیڈمی کراچی، سنہ ندارد۔

عبدالمعبود، محمد، تاریخ مکہ مکرمہ، مکتبہ الحبیب راول پنڈی، ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء۔

غازی، حامد الانصاری، اسلام کا نظام حکومت، ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۴۳ء۔

غازی، محمد طارق، نظریۂ تہذیب، اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن، ممبئی، ۲۰۱۷ء۔(ISBN1-56316-921-5)

کرارہ مصری، عباس، حرم مکی، ار۔تر: تاریخ حرمین شریفین، الفلاح بی اے، مکتبہ رحمانیہ لاہور۔

ندوی، سید سلیمان، تاریخ ارض القرآن، مطبع معارف، اعظم گڑھ، سنہ ندارد۔

ندوی، سید سلیمان، سیرۃ عائشہؓ، مطبع معارف، اعظم گڑھ، سنہ ندارد۔

نعمانی، شبلی، الفاروق، ناز پبلشنگ ہاؤس دہلی، سنہ ندارد۔

ہیکل، محمد حسین، ابوبکر (ار۔تر: شیخ محمد احمد پانی پتی)، مکتبہ میری لائبریری لاہور، طبع پنجم ۱۹۷۳ء۔

اسلام اور ہندو دھرم کا فلسفۂ اخلاق
ایک تقابلی جائزہ

ڈاکٹر محمد احمد نعیمی

اسلام: اسلام نے جو اخلاقی قدریں متعین کی ہیں وہ انتہائی بلند اہمیت اور بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔ ایمان اور اخلاق حسنہ لازم ملزوم ہیں، جس کا ایمان جتنا زیادہ کامل ہوگا اس کے اخلاق بھی اتنے ہی عمدہ ہوں گے۔ اخلاق حسنہ انسان کی اس فطری وطبعی اور مستحکم قوت کا نام ہے کہ جس سے اعمال حسنہ وعمدہ افعال بآسانی صادر ہوتے ہیں۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ:

"خُلق نفس کی اس ہیئت راسخہ کا نام ہے جس سے تمام اخلاق بلا تکلف صادر ہوں۔ اگر افعال عقلاً وشرعاً عمدہ اور قابل تعریف ہوں تو اس حیثیت کو خلق حسن یا نیک اور اگر برے اور قابل مذمت ہوں تو اسے خُلق بد کہتے ہیں"۔ (دائرۃ المعارف الاسلامیہ، ص ۱۸۸، بعنوان لفظ اخلاق)

لفظ "اخلاق" صیغۂ جمع ہے اور اس کا واحد لفظ "خلق" ہے جس کے مختلف معانی ہیں۔ علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ:

"خَلق اور خُلق دونوں کی اصل ایک ہے لیکن خُلق کا لفظ ان ہیئت واشکال اور صورتوں کے لیے مخصوص ہے کہ جن کا آنکھ کے ذریعہ ادراک کیا جاتا ہے اور خُلق کا لفظ ان قوتوں اور خصلتوں کے لیے خاص ہے جن کا بصیرت کے ساتھ ادراک کیا جاتا ہے"۔ (المفردات الراغب، ص ۱۵۸)

مندرجہ تعریفات کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ وہ اعمال وافعال جو کسی وقتی وعارضی جذبہ کے تحت ظاہر ہوں ان پر "خُلق" کا اطلاق نہیں ہوسکتا بلکہ "خُلق یا اخلاق حسنہ" صرف انہیں صفات محمودہ اور عمدہ اخلاق کو کہہ سکتے ہیں جو مستحکم ہوکر فطرت وطبیعت کا حصہ بن گئے ہوں۔

استاذ شعبۂ علوم اسلامیہ، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اسلامی اخلاق واقدار کو جہاں ایک طرف ہمہ گیر و جامعیت کا مقام حاصل ہے وہاں دوسری طرف اس کی یہ بھی امتیازی خصوصیت ہے کہ اس کے احکام وحقوق کی ادائیگی میں ہی کامل ایمان واسلام کی علامت اور مکمل مسلمان ہونے کی ضمانت ہے۔ ساری کائنات میں چونکہ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ سب سے اعلیٰ اخلاق حسنہ واوصاف حمیدہ کے مالک ہیں اس لیے آپؐ کو سراپا خلق عظیم تسلیم کیا گیا۔ ارشاد خداوندی ہے کہ:

وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔ (سورۃ القلم:۴)

اور بے شک آپ کے اخلاق کی بڑی شان ہے۔

اسی طرح ارشاد فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (سورۂ احزاب:۲۱)

بیشک تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اسوۂ حسنہ ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خود ارشاد فرماتے ہیں کہ:

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ (موطا امام مالک، باب حسن الخلق، حدیث ۲۱۷۸)

میں اس لیے بھیجا گیا ہوں تاکہ اخلاق حسنہ کو مکمل کردوں۔

آپؐ کے اقوال ہیں کہ:

اکمل المومنین ایمانا احسنھم خُلُقًا۔ (سنن ترمذی، ۳/۴۶۶، الحدیث ۱۱۶۲)

مومنوں میں سے کامل ترین ایمان والے وہ ہیں جو ان میں سے بہترین اخلاق کے مالک ہیں۔

ان من خیارکم احسنکم اخلاقًا۔ (صحیح مسلم، کتاب الفضائل، حدیث ۶۰۳۳)

تم میں سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔

ان اثقل شیئٍ یوضع فی المیزان المومن یوم القیامۃ خلق حسن و ان اللہ لیبغض الفاحش البذی۔ (مشکوٰۃ المصابیح، باب الرفق وحسن الخلق، حدیث ۱۳/ ۴۸۵۷)

بہت وزنی شے جو مومن کی میزان عمل میں رکھی جائیں گی وہ اچھے اخلاق ہوں گے اور اللہ تعالیٰ فحش گو اور بد اخلاق پر غضب فرماتا ہے۔

ہندو دھرم: اسلام کی طرح قدیم ہندو دھرم میں بھی اخلاقی تعلیمات پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

قدیم ہندو دھرم گرنتھوں وشاستروں کی روشنی میں اخلاقی تعلیمات کے بغیر باہمی سماجی میل جول ورہن سہن اور آپسی برتاؤ وسلوک بحسن وخوبی عمل میں نہیں آسکتے۔اخلاق مند انسان ہی معاشرہ میں امن وسکون سے رہ سکتا ہے اور سچائی، پاکی، صفائی، ایمان داری اور اعلیٰ کردار کی قدروں کو اپنی زندگی کے لیے نمونۂ عمل بنا سکتا ہے۔

قدیم ہندو دھرم گرنتھوں کے مطابق اخلاقی تعلیمات انسانی زندگی کی کامیابی وخوشحالی کے لیے ایک بہترین ضابطہ ودستور ہیں۔زندگی کی ترقی وتنزلی ہوتی ہے، کامیابی وناکامی، اعلیٰ مرتبہ وشرف اور مادی وجسمانی ارتقاء کے ذریعہ انسان فلاح یا نجات کا کس طرح حقدار ہوتا ہے، اس کا حل اخلاقی تعلیمات میں ہے۔

قدیم ہندو دھرم شاستروں نے اخلاق وآداب کو دھرم کا خاص حصہ تسلیم کیا ہے اور کہا ہے کہ وید، اپنشد اور اسمرتیوں وغیرہ کی اخلاقی تعلیمات دھرم کے لیے مشعل راہ ہیں۔چنانچہ منو اسمرتی میں مذکور ہے کہ:

> وید، اسمرتی، حسن اخلاق اور اپنی اپنی آتما (روح) کا پسندیدہ اطمینان یہ چار سراپا دھرم کی علامات ہیں۔ (منو اسمرتی، ادھیائے ۲، اشلوک ۱۲)

منو اسمرتی کے مطابق اخلاق مند انسان کو ہی مذہبی اعمال کا بہتر اجر حاصل ہوتا ہے۔ بد اخلاق کو وید کے پڑھنے وغیرہ کا ثواب نہیں ہوتا ہے۔منو مہاراج کہتے ہیں:

> بد اخلاق برہمن کو وید کا پھل نہیں حاصل ہوتا ہے اور اخلاق مند برہمن وید کا مکمل پھل پالیتا ہے۔منیوں نے اخلاق ہی سے سب دھرموں کی کامیابی دیکھ کر اخلاق کو سبھی عبادات وریاضات کی اصل تسلیم کیا ہے۔(منو اسمرتی، ادھیائے ۲، اشلوک ۱۲)

یہی بات بھاگوت میں کہی گئی ہے کہ زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت نیک صفات وعمدہ اخلاق کی ہے۔لہٰذا نیک صفات یا حسن اخلاق سے ہی متصف ہونا چاہیے اور ایسا کام کرنا چاہیے جس میں سب کا بھلا ہو کسی پر ظلم نہ ہو۔

अहिंसा सत्यमरत्तेयमकामक्रोध लोभता | भूताप्रियहितेहा च धर्मोयं सार्ववणिक ||

''वेदों व पुराणों के आधर पर धर्मिक एकता की ज्योति पृ० 19 ता 21''

آچاریہ چاڑنکیہ نے بھی اخلاقی اقدار کو انسان کی مذہبی و دنیاوی زندگی کے لیے لازمی قرار دیا ہے اور کہا ہے:

ہمیشہ نیک انسانوں کے اخلاق کا ہی اتباع کرنا چاہیے۔ کبھی بھی سیرت و کردار پر داغ نہ لگنے دے۔ کبھی بھی تہذیب و اخلاق کے معیار کو برباد نہ کرے۔ انسان کو ہمیشہ کوشاں رہنا چاہیے کہ اس کی بدنامی نہ ہو کہ بدنامی ہی اس کی موت ہے۔ (چاڑنکیہ سوتر اڑی، سوتر ۳۱۰، ۱۶۳، ۳۱۱، ۳۱۵)

مختصر یہ کہ ہندو دھرم گرنتھوں اور ان کے محققین و علماء نے اخلاقی تعلیمات کو انسان کی مذہبی، دنیاوی، انفرادی، عائلی، قومی اور سماجی زندگی کی خوشحالی و ترقی اور امن اور شانتی کے لیے ناگزیر تسلیم کیا ہے۔ ان تعلیمات کو مختلف انداز میں بلا عمل بنانے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ منو مہاراج کہتے ہیں:

اخلاق سے عمر حاصل ہوتی ہے، اخلاق سے پسندیدہ اولاد حاصل ہوتی ہے، اخلاق سے لازوال دولت کا فائدہ ہوتا ہے، اخلاق سے منحوس علامات کا خاتمہ ہوتا ہے۔ (منواسمرتی، ادھیائے ۴، اشلوک ۱۵۷۔۱۵۸)

بداخلاق انسان دنیا میں ذلیل، ہمیشہ رنجیدہ، مریض اور کم عمر والا ہوتا ہے۔ تمام خوبیوں سے عاری ہونے پر بھی جو مرد بااخلاق اور عقیدت مند ہوتا ہے اور دوسروں کے عیبوں کو بیان نہیں کرتا ہے وہ سوسال جیتا ہے۔ (منواسمرتی، ادھیائے ۴، اشلوک ۱۵۷، ۱۵۸)

ہندو دھرم میں نجات و کامیابی اور عبادت کے جدا جدا طریقے ہیں۔ وہ چاہے بھگتی کا راستہ ہو یا علم کا، یوگ مارگ ہو یا تنتر مارگ، ہر جگہ پاک وصاف اور اچھے اخلاق و عادات کی ہدایت کی گئی ہے اور صاف طور پر آگاہ کیا گیا ہے کہ اخلاقی تعلیمات ہندو دھرم کی بنیاد۔ یم اور نیَم کے بنا کچھ نہیں ہوتا ہے بلکہ نیم سے بھی زیادہ ضروری ہے یم کے احکام و اصول پر عمل کرنا۔ منو مہاراج کہتے ہیں:

عقل مند انسان صرف نیموں کو ہی روزانہ نہ بجالائے، ''یموں'' کا ہمیشہ پالن کرے جو صرف نیموں کی پیروی کرتا ہے وہ ذلیل ہوتا ہے۔ (منواسمرتی ادھیائے ۴، اشلوک ۲۰۴)

ان اشلوکوں میں یم سے مراد اخلاقی اقدار ہیں۔ جو کہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ बहमचर्य (نفس کشی و ریاضت) ۲۔ दया (مہربانی و رحم) ۳۔ क्षमा (معافی)

۴۔ ध्यान (ذکر و فکر) ۵۔ सत्य (سچ) ۶۔ नम्रता (نرمی)

۷۔ अहिंसा (پیار و محبت) ۸۔ چوری نہ کرنا۔ ۹۔ मधुरस्वभाव (خوش مزاجی)

۱۰۔ इन्दियों का दमन (حواس پر کنٹرول)۔ (ویدک دھرم کیا کہتا ہے، حصہ ۲، ص ۱۲)

اس طرح ہندو دھرم گرنتھوں نے انسان کو نیم اور یم کے اخلاقی احکام و اصول کے ساتھ زندگی کی خوشحالی و ترقی کے لیے اخلاق و آداب پیش کیے ہیں۔ چنانچہ یجر وید میں مذکور ہے:

انسانی زندگی ہمیشہ یگ کے اچھے کاموں کے لیے ہو۔ انسان اپنی جسمانی طاقت اور سانس سے اچھے کام کرنے کا اہل ہو۔ آنکھ اچھا دیکھے، کان اچھا سنے، آواز اچھی بولے، دل اچھا ارادہ کرے، روح ہمیشہ اچھائی پر قائم رہے، علم ہمیشہ ایشور (خدا) اور عظیم کاموں کی طرف لے جائے، عقل کی ترقی اور روشنی یگ کے کاموں کے لیے ہو، اختیار اور سب کچھ خدائی کاموں کے لیے ہو، بات چیت، سوال جواب، پڑھنا پڑھانا سب یگ کے لیے ہو اور یگ والا (یگمیہ) دھرم و کام بھی سچائی سے یگ کے لیے ہو۔ (یجر وید، ادھیائے ۱۸ منترا۔ ۲۹)

رگ وید میں ایک ایشور سے دعا کی گئی ہے:

اے سنسار کے پیدا کرنے والے ایشور! آپ ہماری ساری بری خصلتوں کو دور کیجیے اور جو مفید صفات ہوں انہیں ہمیں عطا کیجیے۔ (ویدک ساہتیہ میں مانو کرتویہ، ص ۱۵۸)

اسلام اور ہندو دھرم میں انسان کی ذاتی و عائلی، قومی و ملی، مذہبی و سماجی زندگی کے لیے بہت سے اخلاقی اصول و آداب بیان فرمائے گئے ہیں، چند مشہور و معروف اخلاق و اقدار کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

ادب و احترام اور سلام: (اسلام) ادب و احترام اور سلام اخلاق کا اہم ترین طور طریقہ ہے، جو تقریباً دنیا کے ہر مذہب و قوم میں مختلف انداز میں پایا جاتا ہے۔ کہیں ہاتھ اٹھا کر ادب و احترام اور سلام کیا جاتا ہے تو کہیں پیر چھو کر۔ کہیں اس کو زبان سے ادا کرتے ہیں تو کہیں بوسہ لے کر، کہیں سر جھکا کر تو کہیں گلے مل کر۔ اسی طرح ادب و احترام اور سلام کے وقت جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ بھی باعتبار زبان و قوم اور علاقہ مختلف نوعیت کے ہیں۔ سلام سے چونکہ آپس میں محبت و خلوص، خیر خواہی، وفاداری اور ہمدردی کے جذبات بیدار ہوتے ہیں، اس لیے اسلام نے اس کو ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا حق قرار دیا ہے اور زیادہ سے زیادہ سلام کو فروغ دینے اور اس کو اپنی عادت میں شامل کرنے

کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا علٰی اَنْفُسِکُمْ تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ مُبٰرَکَةً طَیِّبَةً۔ (سورۃ النور،٦١)

اور جب کسی گھر میں جاؤ تو گھر والوں کو سلام کرو۔ یہ اللہ کی طرف سے مبارک و پاکیزہ تحفہ ہے۔

وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْھَا اَوْ رُدُّوْھَا۔ (سورۃ النساء،٨٦)

اور جب تمھیں کوئی کسی لفظ سے سلام کرے تو تم اس سے بہتر لفظ جواب میں کہو یا وہی کہو۔

اور حدیث پاک میں بھی اس کی تشریح و تفسیر تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

لا تدخلون الجنة حتّٰی تؤمنوا ولا تؤمنوا حتّٰی تحابّوا اَوَلاادلکم علٰی شیٔ اذا فعلتموہ تحاببتم؟ افشوا السلام بینکم۔ (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب افشاء السلام، حدیث ۵۴)

تم جنت میں داخل نہیں ہو گے جب تک تم ایمان نہ لاؤ اور تم مومن نہیں ہو سکتے جب تک تم ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔ کیا میں تمھیں ایک ایسی چیز نہ بتاؤں جس پر تم عمل کرو تو ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو؟ فرمایا اپنے درمیان سلام کو عام کرو۔

نیز فرمایا کہ:

یسلم الراکب علی الماشی والماشی علی القاعد والقلیل علی الکثیر۔ (صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب تسلیم القلیل علی الکثیر، حدیث ۵۸۷۷)

سوار پیدل چلنے والے کو سلام کرے، پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور تھوڑے آدمی زیادہ تعداد والوں کو سلام کریں۔

سلام سب کے لیے ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری شریف میں مذکور ہے کہ:

ان رجلا سال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ای الاسلام خیر؟ قال تطعمھم

بے شک ایک آدمی نے سوال کیا: یا رسول اللہ بہتر اسلام کیا ہے؟ فرمایا بہتر

الطعام، و تقرأ السلام علیٰ من عرفت و من لم تعرف۔ (صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب اطعام الطعام من الاسلام، حدیث ۱۲)

اسلام یہ ہے کہ تم دوسروں کو کھانا کھلاؤ اور ہر ایک کو سلام کرو چاہے تم اس کو جانتے ہو یا نہیں جانتے ہو۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ:

ان النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم مرّ علی جلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین عبدۃ الاوثان والیھود فسلم علیھم النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ (صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط، حدیث ۵۸۹۹)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی مجلس کے پاس سے گزرے جس میں مسلمان، مشرک، بت پرست اور یہودی سبھی تھے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سلام کیا۔

(ہندو دھرم): اسلام کی طرح ہندو دھرم نے بھی اپنے پیروکاروں کو ادب واحترام اور سلام کا درس دیا ہے اور جو لوگ عمر یا رشتے ناطے میں چھوٹے یا بڑے یا مذہبی لحاظ سے بزرگ ہیں ان کے ادب واحترام اور سلام کے لیے ایک اخلاقی دستور متعین کیا ہے۔ چنانچہ یجروید میں مرقوم ہے کہ:

تم لوگ زیادہ بوڑھوں کو: नम یعنی عزت واحترام کرو اور چھوٹے بچوں کو نَمَ اور بڑے بھائی و برہمن اور چھوٹے اور نیچ کو بھی نَم کرو۔ اور بھائی، چھتری، ویش اور ڈھیٹ پن چھوڑے ہوئے اچھی عادت والے کو نَم کرو۔ اور نیچ کام کرنے والے شودر و ملیچھ اور آسمان میں ہوئے بادل کی طرح موجود سخی انسان کو سلام (نَم) کرو۔ (یجروید، ادھیائے ۱۶، منتر ۳۲)

ویدوں کے علاوہ دیگر قدیم دھرم گرنتھوں سے بھی یہی سبق ملتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے جب روبرو ہو تو احتراماً سب سے پہلے آداب وتسلیم (پرڑام) بجالائے کہ یہی قدیم رشیوں و منیوں اور مہاپرشوں کا طریقہ ہے اور اس کے کثیر اخروی و دنیاوی فوائد ہیں۔ منوا سمرتی میں ہے کہ:

روزانہ بڑوں کی خدمت اور پرڑام کرنے والے شخص کی عمر، تعلیم، نیکی اور طاقت یہ چاروں چیزیں بڑھتی ہیں۔ (منوا سمرتی، ادھیائے ۲، اشلوک ۱۲۱)

بزرگوں کے گھر آنے پر اُٹھ کر انہیں پرڑام کرے، اپنی جگہ بیٹھنے کو دے اور ہاتھ جوڑ کر

آگے کھڑا رہے۔ جب وہ جانے لگیں تب کچھ دور تک ان کے پیچھے جائے۔ (منواسمرتی، ادھیائے ۲، اشلوک ۱۱۷)

قدیم برہمنوں کا طرز عمل بیان کرتے ہوئے برہمن گرنتھوں میں کہا گیا ہے:

اے वैश्रवण! آپ رعایا کے محافظ چھتری ہم لوگ برہمن ہیں۔ آپ کو نمستے ہو۔ آپ ہمیں نہ ماریے۔ (تیتریا برہمن، ۱۔۳۱۔۳)

دیوتا لوگ بھی آپس میں نمستے کرتے تھے۔ چنانچہ پرانوں میں لکھا ہے کہ:

اے شنکر جی! آپ کو بار بار نمستے ہو میں آپ کی پناہ میں ہوں۔ (پدپرام، پاٹھ کھنڈ ۱۰۵/۲۳۴)

اے مہادیو جی! آپ کو نمستے۔ آپ ہماری حفاظت کریں۔ ہم آپ کی پناہ میں ہیں۔ (اسکند، ماپو برہمن سنکھیا سے ما، ۳۱/۴۰)

شری رام اور مہادیو نے جو ایک دوسرے کو نمستے کیا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے: (اے بھکتوں کے لیے مہربان! نمستے)

شری رام کے جواب میں شنکر جی نے کہا:

اے دیو نمستے! اچھا آپ اپنے مقام شویت دویپ میں جایئے۔ (پدم پران اسمرتی کھنڈ ۱۳۹/۴۰، ۱۵۵/۴۰)

معلوم ہوا کہ اسلام اور ہندو دھرم دونوں میں آداب و تسلیم کا اخلاقی دستور پایا جاتا ہے۔ لیکن دونوں مذاہب میں فرق یہ ہے کہ اسلام میں آداب و تسلیم کے لیے صرف ''السلام علیکم'' اور جواب میں ''وعلیکم السلام'' استعمال ہوتا ہے۔ جب کہ ہندو دھرم میں سلام اور اس کے جواب کے لیے بہت سے الفاظ مستعمل ہیں۔ جن میں سے بعض وہ الفاظ ہیں کہ جن کا قدیم ہندو دھرم گرنتھوں میں تذکرہ ہے۔ جیسے نمہ، نمستے اور پرنام۔ دھرم شاستروں میں اکثر مقامات پر نمستے لفظ ہی استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں آپ کے لیے آداب و تسلیم۔ اس میں نمہ کا معنی ہے جھکنا اور تے کا معنی ہے آپ کے اندر جو خدائی عنصر ہے اس کے سامنے جھکنا یعنی آپ کے اندر جو خدائی شئے ہے میں اس کے سامنے سرخم کرتا ہوں اور مذکورہ بالا معانی کی روشنی میں نمسکار کا معنی ہوتا ہے آپ کے لیے فرماں بردار یا آپ کے لیے اطاعت گذار ہوں، آپ کے سامنے جھکنے کا میں آچرن کرنے والا ہوں اور آپ کے سامنے میں ہمیشہ

ادب و اخلاق سے رہنے والا ہوں لیکن بعض وہ کلمات ہیں کہ جن کا دھرم شاستروں میں کوئی ذکر نہیں بلکہ نئی ایجاد ہیں۔ پروفیسر رام وچار لکھتے ہیں:

"ہندوؤں نے "نمستے" کا لفظ بھلا کر کئی نئے الفاظ جاری کیے ہیں جیسے "جے رام جی، رام رام، جے شری کرشن، جے رادھے شیام، جے گوپال جی، پالا گن، بھولے شمبھو، جے جگدمبا، جے جمنا میّا کی، ست صاحب، ست شری اکال، نمو نارائن اور نمسکار وغیرہ یہ سبھی (कपोलकल्पित) الفاظ ہیں۔ ان میں کوئی بھی خیر مقدم (अभिवादन) وید کے مطابق نہیں ہے"۔ (ویدک دھرم کا سوروپ، ص ۲۱)

عفوو درگزر: (اسلام) پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی محبوب سنت ہے۔ آپؐ نے کبھی کسی سے کوئی ذاتی انتقام نہیں لیا بلکہ سخت سے سخت دشمن کو بھی معاف فرما دیا۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

خذا العفو و امر بالعرف و اعرض عن الجاهلين۔ (الاعراف: ۱۹۹)
اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! معاف کرنا اختیار کرو اور بھلائی کا حکم دو اور جاہلوں سے منھ پھیر لو۔

والكاظمين الغيظ والعافين عن الناس والله يحب المحسنين۔ (آل عمران: ۱۳۴)
اور غصہ پینے والوں اور معاف کرنے والوں کو اللہ پسند فرماتا ہے

کفار مکہ نے مسلسل پیغمبر اسلامؐ اور آپؐ کے متبعین پر جسمانی، مالی، ذہنی، قلبی اور سماجی ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا کیا۔ مکہ فتح ہوا تو آپؐ نے ان سارے دشمنوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ معاف فرما دیا، جنہوں نے طرح طرح کے ظلم و تشدد کا آپؐ اور آپؐ کے جاں نثار صحابۂ کرامؓ کے لیے روا رکھا تھا۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو حضور انورؐ کے ایک صحابی حضرت سعدؓ بن عبادہ نے ابوسفیان سے کہا "**اليوم يوم الملحمه**" آج لڑائی کا دن ہے، آج انتقام کا دن ہے، آج ماضی کے ظلم وستم کا بدلہ لیا جائے گا۔ یہ سن کر حضور انورؐ اتنا ناراض ہوئے کہ ان سے جھنڈا لے کر ان کے بیٹے قیس کے سپرد فرما دیا اور ابوسفیان سے فرمایا "**اليوم يوم المرحمة**" آج انتقام کا نہیں بلکہ آج رحمت اور معاف کرنے کا دن ہے۔ (ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، ج ۸، ص ۹، انسان العیون، ج ۳، ص ۲۲، دار نشر الکتب الاسلامیہ، ۱۹۸۱ء)

(ہندودھرم): یہ اخلاقی نظریہ ہندودھرم گرنتھوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بالمیکی رامائن میں کہا گیا ہے:

عورتوں اور مردوں کا اگر کوئی حقیقی زیور ہے، تو وہ معافی ہی ہے۔ معافی ہی دان ہے معافی ہی سچ ہے، معافی ہی یگ ہے معافی نیکی ہے، معافی ہی دھرم ہے۔ یہ سارا سنسار معافی سے ہی گھرا ہوا ہے۔ (بالمیکی رامائن، بال ۳۳/ ۷-۸)

مہابھارت میں معافی کی اہمیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

لالچ سے غصہ پیدا ہوتا ہے اور دوسرے کے عیب دیکھنے سے وہ بڑھتا ہے اور معاف کرنے سے وہ رک جاتا ہے اور معافی سے ہی وہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔ (مہابھارت، شانتی پرو، ۱۶۳/ ۷-۸)

بالمیک رامائن میں غصہ پی جانے والوں کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

حقیقت میں وہ مہاتما لوگ خوش نصیب ہیں جو اپنے اندر اٹھے ہوئے غصہ کو اس طرح بجھا دیتے ہیں جس طرح جلتی ہوئی آگ کو پانی۔ (بالمیکی رامائن، سندر کانڈ، ۵۵/ ۴)

اسلام نے ہمیشہ خوش کلامی، اچھی گفتگو کرنے کی ہدایت ونصیحت کی ہے اور غلط بیانی اور بدکلامی سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ حضور انورؐ ارشاد فرماتے ہیں:

لیس المؤمن بالطّعان و لا اللّعان و لا الفاحش و لا البذیئ۔ (جامع ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی اللعنۃ، حدیث ۱۹۷۷)	مومن طعنہ زنی کرنے والا، لعنت کرنے والا، فحش گوئی کرنے والا اور زبان درازی کرنے والا نہیں ہوتا ہے۔
ان اللہ لا یحب الفاحش المتوحش۔ (صحیح بخاری، کتاب الایمان، حدیث ۴۸، سنن ابوداؤد، ج ۳، کتاب الآداب، حدیث ۱۳۶۶)	بے شک اللہ تعالیٰ فحش گو اور گندی بات کرنے والے کو پسند نہیں فرماتا ہے۔
من یضمن لی مابین لحییه و مابین رجلیه اضمن له الجنّة۔ (صحیح بخاری،	جو مجھے اپنے دو جبڑوں اور ٹانگوں کے مابین یعنی زبان اور شرم گاہ کی ضمانت دے تو میں

کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان، حدیث ۶۱۰۹) اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

زبان کی بے احتیاطی کی وجہ سے انسان اکثر گناہوں کا مرتکب اور جہنم کا سزاوار ہوتا ہے، اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے اجتناب اور نجات کے لیے ارشاد فرماتے ہیں:

من صمت نجا۔ (جامع ترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق، حدیث ۲۰۰۱) جو بری باتوں سے خاموش رہا وہ نجات پا گیا۔

اسی طرح حضرت عقبہ بن عامر فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

یا رسول اللہ ما النجاۃ ؟ قال: امسک علیک لسانک۔ (جامع ترمذی، کتاب الزہد، حدیث ۲۴۰۶) یارسول اللہ نجات کیا ہے؟ فرمایا اپنی زبان کو بری باتوں سے روکے رکھو۔

اسلامی نقطۂ نظر سے گفتگو اور لہجہ نرم ہو اور بات صاف سادہ ہو۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یٰـاَیُّھَـا الَّـذِیۡنَ اٰمَنُـوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ قُوۡلُوۡا قَـوۡلًا سَدِیۡدًا۔ (الاحزاب:۷۰) اے مومنو! اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کہا کرو۔

حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کو تلقین ہوئی کہ:

اِذۡھَبَا اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّہٗ طَغٰی فَقُوۡلَا لَہٗ قَوۡلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوۡ یَخۡشٰی۔ (سورۃ طہٰ:۴۴،۴۵) جب آپ دونوں فرعون کے پاس جائیں تو بے شک اس نے سرکشی کی ہے تو اس سے نرم انداز میں بات کرنا تا کہ وہ نصیحت پکڑے اور اللہ سے ڈرے۔

ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ احتیاط کے ساتھ کلام کرے، اچھی و عمدہ گفتگو نرم لب و لہجے میں کرے اور منہ بگاڑ کر بات نہ کرے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَلَا تُصَعِّرۡ خَدَّكَ لِلنَّاسِ۔ (لقمان:۱۸) اور کسی سے بات کرنے میں منہ بگاڑ کر بات نہ کرو۔

(ہندو دھرم): ہندو دھرم گرنتھوں میں نرم گفتاری و شیریں کلامی کی مختلف انداز میں تعلیم دی گئی ہے۔ کہیں دعائیہ انداز میں اس کی آرزو کی گئی ہے اور کہیں اس کے فوائد و نقصانات کے ضمن میں اس کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ چنانچہ ویدوں میں مذکور ہے:

اے ایشور! ہماری زندگی مٹھاس سے بھرپور ہو، آپ اپنے اثر سے پوری طرح ہماری زندگی کو مٹھاس سے بھرپور کردیں کیونکہ مٹھاس ہی پیار، لگاؤ، بھلائی اور سخاوت کی بنیاد ہے۔ اسی سے ہر کام میں کشش پیدا ہوتی ہے۔ (رگ وید، ۱۰۔ ۲۴۔ ۶)

میری زبان کے اگلے حصے میں مٹھاس ہو اور زبان کی جڑ میں مٹھاس ہو، اے شیرینی! میرے عمل میں تیرا مقام ہو اور میرے دل کے اندر بھی تو پہنچ جا، میرا آنا جانا میٹھا ہو، میں جو زبان بولوں وہ میٹھی ہو اور میں خود مٹھاس کی مورتی بن جاؤں۔ (ویدک ساہتیہ میں مانو کرتویہ، ص ۱۵۳)

دعا پر توجہ دینے والے، اچھی بات یا تعریف کے خواہش منداور بارعب اندر کے لیے گھی اور شہد سے بھی زیادہ ذائقہ دار اور خوبصورت بات بولو۔ (رگ وید، ۸۔ ۲۴۔ ۲۰)

بری حالت دور ہو، آواز طاقت ور اور میٹھی ہو، گفتگو کی صلاحیت مٹھاس سے بھری ہو، میں شیریں کلام بولوں۔ (اتھر وید، ۱۶۔ ۲۔ ۱، ۲)

مذکورہ بالا منتروں میں نرم گفتاری و شیریں کلامی کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس سخت گفتار و ترش کلام کے جو نتائج ہیں ان کی روشنی میں مہابھارت میں کہا گیا ہے کہ:

اگر سماج میں ہر دل عزیز ہونا چاہتے ہو اور سب کو اپنے بس میں کرنا چاہتے ہو تو دوسروں کی مذمت اور سخت کلامی چھوڑ دو۔ (مہابھارت)

اسی اتھر وید میں ایک مقام پر دعا کی گئی ہے کہ اے ایشور مجھے شہد سے زیادہ میٹھا کردے جس سے میں لوگوں سے میٹھی بات بولا کروں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام ہی کی طرح قدیم ہندو دھرم میں لوگوں سے نرمی و شیریں انداز میں گفتگو کرنے کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔

اتحاد و بھائی چارہ اور آپسی محبت و ہمدردی: (اسلام) اسلام اخوت اور بھائی چارہ اور دوستانہ و ہمدردانہ تعلقات استوار کرتے ہوئے زندگی گزارنے کی تعلیم دیتا ہے اور اسی جذبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے باہمی ملاقات، اٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کا انداز اپنانے کا سبق دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ۔ (الحجرات: ۱۰) مسلمان مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ۔ (التوبہ:۷۱)

اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

قرآن کریم کے علاوہ احادیث رسولؐ سے بھی یہی سبق ملتا ہے کہ مسلمانوں کو آپس میں اخوت و ہمدردی سے مل جل کر رہنا چاہیے۔ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے رنج و تکلیف کا احساس ہونا چاہیے اور مشکل وقت میں اس کی مدد کرنی چاہیے۔حضور انورؐ ارشاد فرماتے ہیں:

المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضهٔ بعضاً ثم شبّک بین اصابعه۔(مشکوۃ المصابیح، باب الشفقۃ، ص ۴۱۴)

مسلمان مسلمان کے لیے عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کے لیے سہارا بنتا ہے۔پھر آپؐ نے مثال دیتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں ڈالیں۔

یعنی مسلمان کو اس طرح مل جل کر رہنا چاہیے کہ وہ مصیبت و پریشانی کے حالات میں ایک دوسرے کے معاون بن سکیں۔

المؤمنون کرجل واحد ان اشتکی عینهٔ اشتکی کلّهٔ ان اشتکی رأسهٔ اشتکیٰ کلّهٔ ۔ (مشکوۃ المصابیح، باب الشفقۃ، ص ۴۱۴)

تمام مسلمان ایک آدمی کی طرح ہیں، اگر آنکھ دکھتی ہے تو سارا جسم بے چین ہو جاتا ہے، اگر سر میں درد ہوتا ہے تو سارا جسم بے چینی اور پریشانی کا احساس کرتا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں:

لا تدخلون الجنة حتی تؤمنوا و لا تؤمنوا حتی تحابُّوا۔(صحیح مسلم کتاب الایمان، حدیث ۵۴)

تم جنت میں داخل نہیں ہوگے جب تک ایمان نہ لاؤ اور تم مومن نہیں ہو سکتے جب تک تم ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔

لا یؤمن احدکم حتّی یحب لاخیه ما یحب لنفسه۔ (صحیح بخاری، ج ۳، کتاب الایمان، باب ۷، حدیث ۱۲)

تم میں کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

حق المسلم علی المسلم ست۔

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق

قیل ما ھن؟ یا رسول اللہ! قال: اذا لقیتہ فسلم علیہ و اذا دعاک فاجبہ و اذا ستنصحک فانصح لہ و اذا عطس فحمد اللہ فسمتہ و اذا مرض فعدہ و اذا مات فاتبعہ۔ (صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الامر باتباع الجنائز، حدیث ۱۱۸۳)

ہیں، عرض کیا گیا یا رسول اللہ وہ کیا کیا ہیں؟ فرمایا جب مسلمان سے ملے تو اس کو سلام کرے اور جب وہ تیری دعوت کرے تو قبول کرے، جب تجھ سے وہ مشورہ چاہے تو اچھا مشورہ دے اور جب وہ چھینکے اور الحمدللہ کہے تو تو جواب میں یرحمک اللہ کہہ اور جب بیمار ہو تو اس کی مزاج پرسی کو جا اور جب وہ انتقال کر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ شامل ہو۔

اسی طرح اسلام دنیا کے غیر مسلموں کے ساتھ بھی محبت اور انسان دوستی کی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن وحدیث میں ہے:

و طعام الذین اوتو االکتاب حل لکم و طعامکم حل لھم۔ (المائدہ:۵)

ان کا کھانا جن کو کتاب دی گئی تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔

خود رسول اللہؐ نے غیر مسلم یہودیوں کی دعوت قبول فرمائی، نیز غیر مسلموں کے کھانے کا اہتمام فرمایا ہے۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۴، ص ۱۹۴، بخاری کتاب المغازی، باب الشاۃ التی سمت)

الخلق کلھم عیال اللہ فا حبھم الی اللہ انفعھم لعیالہٖ۔ (مشکوٰۃ المصابیح، باب الشفقہ، حدیث ۴۲۵)

ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور خدا کی نظر میں سب سے محبوب وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔

(ہندودھرم): قدیم ہندودھرم گرنتھوں نے ایکتا و بھائی چارہ اور باہمی محبت و ہمدردی کی اخلاقی تعلیم پر کافی زور دیا ہے اور کہا ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کی حفاظت کرے۔ انہیں مصیبت و تکلیف سے بچائے، آپس میں عداوت نہ رکھے، ایک دوسرے کے ساتھ اچھی گفتگو کرے اور ہمیشہ ایک دوسرے کا تعاون کرے۔ چنانچہ ویدوں کا فرمان ہے کہ:

ہمیں دوست، دشمن، جان، پہچان یا انجان لوگوں سے ڈر نہ ہو اور رات سے کوئی ڈر نہ ہو،

سارا سنسار ہمارا دوست ہو اور دنیا میں رہنے والے سارے جاندار ہمارے دوست ہوں۔
(اتھروید،۱۹۔۱۵۔۲)

آپ سب کی سوچ اور خیال ایک ہوں آپ سب کی مجلس یا جماعت ایک ہو، آپ سب کے دل بھی ایک ہی فکر و خیال سے بندھے ہوں، آپ سب کا من بھی ایک ہو اس لیے تو میں آپ سب کو ایکتا و اتحاد کا یہ راز بتا رہا ہوں۔ ایک ہی نذر سے تم سب کے یگ کو پورا کرتا ہوں۔ (ویدک ساہتیہ میں مانو کرتویہ، ص ۱۹۷)

آپس میں میل جول دوستی قائم کرو، آپس میں بول چال یا مذہب کی چرچا کرو، خود کو نیک اور عمدہ اخلاق سے مزین کرو، جیسے پہلے زمانے کے بزرگ لوگ اپنے فرائض کے حصوں کو ہم خیال ہو کر آپس میں طے کر کے تقسیم کر لیتے تھے، ویسے ہی تم بھی کرو۔ (ویدک ساہتیہ میں مانو کرتویہ، ص ۱۹۷)

اے انسانو! میں ایشور محبت، اتفاق رائے اور عیبوں سے دوری تمہارے لیے پیدا کرتا ہوں۔ پیدا شدہ بچھڑے کو جس طرح گائے پیار کرتی ہے اسی طرح تم سب آپس میں محبت رکھو۔ (اتھروید، ۳۔۳۰۔۱)

تمہارے پانی پینے کا مقام ایک ہو، تمہارے طعام کا مقام ایک ہو، تمہیں ایک بندھن میں ساتھ ساتھ جوڑتا ہوں۔ (اتھروید، ۳۔۳۰۔۵)

آپس میں ایک دوسرے سے پیاری بات بولتے ہوئے آگے بڑھو میں تمہیں دوسروں کو بھلا کرنے والا اور اعلیٰ خیالات سے مزین کرتا ہوں۔ (اتھروید، ۳۔۳۰۔۵)

تم سب کے سارے مقاصد اور خواہشات کی لگن ایک ہی سمت میں ہو، تم سب کے دماغ ایک ہی طرح کی فکر و سوچ سے مالا مال ہوں، تم سب کا من ایک ہو، جس سے تمہاری دوستی پکی اور مضبوط رہے۔ (ویدک ساہتیہ میں مانو کرتویہ، ص ۱۹)

ان میں نہ تو کوئی بڑا ہے اور نہ ہی چھوٹا۔ آپس میں وہ سب بھائی بھائی ہیں۔ (رگ وید، ۵۔۶۰۔۵)

ویدوں کے منتروں میں واضح طور پر باہمی محبت و ہمدردی اور ایکتا و بھائی چارے کی اخلاقی

تعلیم دی گئی ہے۔ یہی تعلیم دیگر دھرم گرنتھوں میں بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ یوگ وششٹھ میں ہے:

یہاں اس دنیا میں سب تکالیف کو مٹانے کے لیے صرف اور صرف دوسرے کی بھلائی کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ (یوگ وششٹھ ، ۳،۶، ۱۴)

گیتا کا قول ہے کہ ایسا شخص ایشور کو بہت پیارا ہے:

جو کسی جاندار سے حسد نہیں کرتا سب کا دوست ہے اور مہربان ہے۔ (گیتا، ۱۲/ ۱۳)

یہی تعلیم رام چرتر مانس میں دی گئی ہے:

دوسروں کی بھلائی سے بڑھ کر کوئی دھرم نہیں ہے اور دوسروں کو تکلیف پہونچانے سے بڑھکر کوئی پاپ نہیں ہے۔ (رام چرتر مانس، اتر کانڈ، ۴۰)

منواسمرتی کا فرمان ہے:

خود دکھی ہوتے ہوئے بھی کسی کا دل نہ دکھائے، دوسرے سے دشمنی کی سوچ بھی نہ رکھے اور ایسی بات بھی نہ بولے جس سے دوسروں کو تکلیف ہو۔

مختصر یہ کہ قدیم ہندو دھرم گرنتھوں میں بہت ہی تاکید کے ساتھ اکثر مقامات پر ایکتا و بھائی چارے اور باہمی محبت و ہمدردی کی مختلف انداز میں ہدایت و نصیحت کی گئی ہے۔

شری مد بھگوت گیتا اور مسلم مصنّفین

ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا

اس کرۂ ارض پر انسان کب نمودار ہوا، کون سی تہذیب پہلے کس ملک میں ترقی پذیر ہوئی اور کب اس کا زوال ہوا اور صفحۂ ہستی سے مٹ گئی، یہ بات ابھی تک پردۂ راز میں ہے۔ موجودہ دور میں دنیا کے مختلف ممالک کے محکمۂ آثار قدیمہ نے جن تہذیبوں کے آثار ڈھونڈ نکالے ہیں، ان میں مایا، مصری، چینی اور ہندوستانی تہذیب قابل ذکر ہیں۔

اسپین اور فرانس میں تیس ایسے غاروں کا پتہ چلا ہے، جن کی دیواروں پر مصوری کے ایسے نمونے ملے ہیں، جن کی قدامت بیس ہزار برس بتائی جاتی ہے۔(۱)

پدم شری مسٹر V.S.Vakankar نے مدھیہ پردیش کے غاروں Bhim betaka کی دیواروں پر ایسی تصاویر کو کھوج نکالا جن کی قدامت ۴۰۰۰۰ برس ق م بتائی گئی ہے۔

ڈاکٹر پی۔وی، وارٹاک نے اپنی کتاب Vastavaramayan میں بتایا ہے کہ ہندوستان میں ۲۰۰۰۰ ق م پرانی تہذیب موجود تھی۔ ماہرین آرکیالوجی اس بات کی تصدیق کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں یہ بھی درج کیا ہے کہ ۱۷۰۰۰ ق م میں جنوبی ہند کے ڈراویڈین امریکہ میں ہجرت کر گئے تھے۔ اس خبر کو موتی لال بنارسی داس (M.L,B.D) نیوز لیٹر اکتوبر ۱۹۸۸ء نے یوں عنوان دیا تھا "DravidianInAmerica"۔

برازیل نیوکلیئر فزکس کے ماہر Arysio Nune dos Santos جو فیڈرل یونیورسٹی آف مناس میں کام کرتے ہیں انھوں نے اپنی رپورٹ میں بتایا ہے کہ کرسٹوفر کولمبس سے صدیوں پہلے

الیف ۲۳۷، لوئر ہری سنگھ نگر رہاڑی کالونی، جموں ۱۸۰۰۰۵۔ Mob:9419828542

جنوبی ہند کے ڈراویڈین ہجرت کر کے امریکہ پہنچ چکے تھے۔ یہ اپنے ساتھ کیلا، اناس، ناریل اور روٹی لائے تھے جو یہاں پہلے موجود نہیں تھے۔

ڈاکٹر ایس بی راؤ ایمیریٹس سائنس داں جو نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشنو گرافی گوا میں کام کرتے ہیں۔ انہوں نے گجرات کے تٹ سمندری پانی کے نیچے سطح پر بھگوان شری کرشن جی مہاراج کے محلات دواریکا کو تلاش کرلیا ہے اور ان کی تاریخ ۶۰۰۰۔۵۰۰۰ ق م بتائی ہے۔

یہ خبر ۲۲/ اکتوبر ۱۹۸۸ء کی صبح کے ہندوستان کے سبھی نمایندہ اخبارات کے پہلے صفحے پر جلی سرخیوں میں شائع ہوئی تھی۔

وادیٔ سندھ کی دو قدیم تہذیبوں کو انگریزوں نے (جو ہڑپا اور منجو دھاڑوں (؟) میں کھدائی کے دوران سامنے آئی ہیں) قیاساً ۳۲۵۰ تا ۲۷۵۰ ق م بتایا ہے۔

دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کے اب تک مختلف قسم کے نشانات ملے ہیں۔ جن میں پتھر، مٹی اور دھات کی بنی ہوئی مختلف دیوی، دیوتاؤں کی تصویریں، تصویری لکھائی، تعویذ، مہریں اور تختیاں سامنے آئیں ہیں۔ اب تک کسی بھی تہذیب کا کوئی مذہبی صحیفہ نہیں مل پایا ہے۔

اب تک موجودہ دور کے محققین کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائے ہیں کہ ان مٹتی ہوئی تہذیبوں کے مذہب کیا تھے۔ کوئی پختہ دستاویز ابھی تک ان کے ہاتھ نہیں لگی ہے۔

ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ ان تہذیبوں میں کوئی مذہب نہیں رہا ہوگا۔ یہ انسانی فطرت میں شامل ہے کہ وہ اپنے معبود کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے دنیا میں کئی تہذیبیں ابھریں، ان کے کئی مذہب رہے ہوں گے، ان کے مٹنے کے ساتھ ساتھ وہ مذہب بھی مٹ گئے ہوں گے۔

یورپین قوم (یعنی انگریز) جہاں جہاں بھی گئی اس نے وہاں وہاں کی تاریخ کو مسخ کرنے کی پوری کوشش کی، اس میں ہمارے بہت سے ہندوستانی اسکالرز بھی شامل ہیں جو صرف مغربی تہذیب اور انگریزی زبان سے متاثر ہیں۔

میکس مولر پہلا یورپین اسکالر تھا جس نے ہندوستان کی قدیم تہذیب اور ہندو مذہب سے متعلق پوری دنیا میں غلط فہمیاں پھیلائیں اور اسی کی پیروی موجودہ دور کے بدیشی اسکالرز اور بعض ہندوستانی کررہے ہیں۔

انہیں موتی لال بنارسی داس نیوز لیٹر اکتوبر ۱۹۸۸ء کے صفحہ نمبر ۶ کا مطالعہ کرنا چاہیے جس پر انہوں نے عنوان قائم کیا تھا 50,000 year old Relias انھیں مدھیہ پردیش کی سنٹرل (وسطیٰ) نرمدا وادی سے کھدائی کے دوران ایسے آثار قدیمہ ملے ہیں جو ۵۰۰۰۰ ق م کے ہیں۔

حال ہی میں Anthro pological sur very of India کے ماہرین کی ایک ٹیم نے دو ضلع (sebore) سی بورے (سیہور؟) اور ہوشنگ آباد میں کھدائی کے دوران ایسے بہت سے ثبوت اکٹھے کیے ہیں جو ہندوستانی تہذیب کی قدامت کو ظاہر کرتے ہیں۔

ان باتوں کو یہاں بیان کرنے کا ہمارا مقصد یہ ہے کہ گردش ایام نے بڑی بڑی قوموں اور تہذیبوں کو صفحۂ ہستی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹا کر رکھ دیا۔

ہندوستان کے قدیم ترین مذہبی صحیفے مقدس چار وید ہیں جنہیں یورپین اسکالرز نے بھی دنیا کے سب سے قدیم صحیفے مانا ہے۔صدیاں نہیں ہزاروں برس گزرنے کے بعد ان کی تعلیمات کا اثر کم ہونا شروع ہوا۔ایک وقت ایسا آیا کہ ایک ہی خاندان کے بھائیوں کے درمیان زمین کے ایک معمولی سے ٹکڑے کی خاطر بہت بڑی جنگ کا اعلان ہوگیا۔جس کے نتیجے میں قدیم بھارت ورش کے حکمرانوں کی فوجیں ہی نہیں بلکہ موجودہ قندھار اور ملک شام تک کے راجاؤں کی فوجیں کوروکھیشتر کے میدان میں (موجودہ ہریانہ) ایک دوسرے کے مقابل آکھڑی ہوئیں۔جن بھائیوں کی مدد کے لیے یہ افواج آئیں تھیں ان کے نام ہے کوروا اور پانڈو۔یہ آپس میں چچازاد بھائی تھے۔اس جنگ کو مہابھارت کے نام سے تاریخ میں یاد کیا جاتا ہے۔

کوروؤں کی طرف سے دریودھن اور پانڈوؤں کی طرف سے یدھشٹر فوجوں کی کمان سنبھالے ہوئے تھے۔پانڈوؤں کے بھائی ارجن کے سارتھی (کوچ وان) بھگوان شری کرشن جی مہاراج بنے ہوئے تھے۔ارجن نے بھگوان شری کرشن جی مہاراج سے کہا کہ میرا رتھ دونوں فوجوں کے درمیان لے چلو تاکہ میں دیکھ سکوں کہ مجھے کن کن لوگوں سے جنگ کرنی ہے۔بھگوان شری کرشن جی مہاراج رتھ کو دونوں فوجوں کے درمیان لا کھڑا کرتے ہیں۔ارجن اپنے سامنے گرو درون آچاریہ، دادا بھیشم پتامہ، اپنے بھائیوں اور سگے سمبندھیوں کو دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتا ہے۔اور دھنش بان (تیر کمان) چھوڑ کر رتھ میں بیٹھ جاتا ہے اور جنگ کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔تب بھگوان شری کرشن جی

مہاراج اسے اپدیش دیتے ہیں اور اس کا حوصلہ بڑھاتے ہیں تب ارجن جنگ کے لیے تیار ہوتا ہے۔

مہابھارت کی جنگ کب لڑی گئی اب ہم آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرتے ہیں۔

مشہور عالم ریاضی داں آریہ بھٹ نے اندازاً ''مہابھارت'' کی تاریخ ۳۱۰۰ ق م درج کی ہے۔ جبکہ پروفیسر (C.V. Vaidya) سی وی واڈیا اور پروفیسر (Apte) آپٹے نے ۳۱۵۱ ق م کا زمانہ درج کیا ہے۔ شری (Kota Venka ta Chalam) کوٹاون کاٹاچالم نے ۳۱۳۹ ق م کا وقت طے کیا ہے لیکن ان حضرات نے جو فلکی سیاروں کا ڈاٹا استعمال کیا ہے اس میں کچھ نقص رہ گئے تھے۔ پونے کے ماہر علم ہیئت (فلکی علم) Dr. P.V. Vartak نے جو شواہد اور ماخذ پیش کیے ہیں اور انہیں موجودہ دور کے دوسرے ماہرین نے جانچ پرکھ کے بعد درست پایا ہے اور جس تاریخ کا تعین کیا ہے وہ ۱۶/اکتوبر ۵۵۶۱ ق م ہے۔ اس دن دو اماوس آئی تھیں جن کا ذکر رشی ویدویاس جی نے مہابھارت میں کیا ہے۔ آج کے دور کے سائنس داں اور ماہرین فلکیات کمپیوٹر کا استعمال کرتے ہیں، جس سے غلطی کا امکان نہیں رہتا۔ اس ثبوت نے بھارتیہ تاریخ میں ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ میں ایک انقلاب برپا کردیا ہے۔

موجودہ دور میں انسان نے مادی طور پر بہت ترقی کرلی ہے۔ وہ چاند اور منگل کی سطح تک جا پہنچا ہے، مگر روحانی طور پر اس نے وہ مقام حاصل نہیں کیا، جسے اسے حاصل کرنا چاہیے تھا۔ اس کرۂ ارض کے تمام مذہبی صحیفے کسی ایک مذہب، قوم، نسل یا ملک کی میراث نہیں بلکہ یہ تمام عالم انسانیت کے لیے ہوتے ہیں۔ ان کی تعلیمات سے پوری انسانی نسل فیض یاب ہوتی رہتی ہے۔ ہم انہیں اپنی مقرر کی ہوئی ملکی سرحدوں میں قید کرکے نہیں رکھ سکتے۔ یہ صحیفے اپنا نور پھیلاتے رہتے ہیں، جس سے انسانی نسل کی برابر ترقی و ترویج ہوتی رہتی ہے۔

ہزاروں برسوں سے یہ مذہبی صحیفے انسانی زندگی کو مادی جکڑ بندیوں سے آزاد کرنے، کائنات و نور الٰہی کے راز منکشف کرنے میں منہمک رہے ہیں۔ یہ روحانیت، علم و دانش اور فلسفے کے بہترین نمونے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کا مطالعہ باقاعدہ کیا جائے تو ان کا راز و فلسفہ خود بخود انسان پر عیاں ہوتا جاتا ہے، انسانی ذہن وسعت اختیار کرتا ہے، تنگ نظری اور محدودیت کی سرحدیں مٹتی جاتی ہیں، تمام شک و شبہات دور ہوتے جاتے ہیں اور میں و تُو کا فرق مٹتا جاتا ہے۔ مگر ایسا ہو نہیں رہا ہے۔

شری مد بھگوت گیتا جی کے ترجمے دنیا کی سبھی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلا ترجمہ اکبر بادشاہ کے حکم سے ان کے مشہور درباری عالم ابوالفیض فیضی نے فارسی میں کیا تھا۔ وہاں سے یہ ترجمہ ایران پہنچا، وہاں سے عرب اور وہاں سے یونان و یورپ تک جا پہنچا۔ آج کے دور میں اس مقدس صحیفے کے ہزاروں ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

اردو دنیا کی واحد زبان ہے جس میں اس علم و دانش کے خزانے کے سب سے زیادہ ترجمے ہوئے ہیں۔ مانک ٹالا نے اپنے مضمون ''بھگوت گیتا کے اردو تراجم'' مطبوعہ ہفت روزہ ''ہماری زبان'' نئی دہلی کے ۲۲ / تا ۲۸ / فروری ۲۰۰۴ء کے شمارہ میں اکیاسی ترجموں کا ذکر کیا ہے، جس میں مسلمان ادبا و شعرا کے چودہ نام شامل ہیں۔ راقم نے اپنے مضمون ''اردو زبان اور ہندوستان'' مطبوعہ ہفت روزہ ''ہماری زبان'' نئی دہلی کے ۲۲ / تا ۲۸ / دسمبر ۲۰۰۴ء کے شمارہ میں دو کا اضافہ کیا تھا، جس میں ایک ترجمہ پٹھان کوٹ کے رامیش امید کھوسلہ کا اور دوسرا امیر ولی اللہ ایبٹ آباد کا تھا۔ پہلا منظوم اور دوسرا گیتا جی کی شرح ہے۔ اس طرح مسلم ادبا و شعرا کے پندرہ ترجمے ہوئے۔ فروغ اردو کونسل نئی دہلی کے ماہنامہ ''اردو دنیا'' کے فروری ۲۰۱۵ء کے شمارہ کے حوالے سے ایک اور منظوم ترجمے کا پتا چلا ہے جسے انور جلال پوری لکھنؤ نے مرتب کیا ہے۔ مبصر منتظر قائمی نے اس کی اشاعت نعمانی پرنٹنگ پریس لکھنؤ سے ۲۰۱۳ء بتائی ہے۔ مبصر انور جلال پوری کے ترجمے کی تعریف کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

> ''انھوں نے شری مد بھگوت گیتا کے ۷۰۱ اشلوکوں کو ۷۰۱ اثلث اور رواں اشعار میں منتقل کر دیا ہے''۔

قدیم زمانے سے لے کر آج تک مقدس گیتا جی کے جتنے بھی ترجمے ہوئے ہیں وہ سات سو اشلوکوں پر مشتمل ہیں۔ یہ بات راقم کی ناقص عقل سے پرے کی بات ہے کہ انور جلال پوری نے ایک اشلوک کا کہاں سے اضافہ کیا ہے۔ مذہبی صحیفوں سے ایسی چھیڑ چھاڑ کسی بھی ذی ہوش کو زیبا نہیں دیتی۔ انور صاحب کو مرحوم ہوئے چند ماہ ہی ہوئے ہیں۔ ہماری یہی دعا ہے کہ مالک کائنات انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

راقم نے اس نسخے کو حاصل کرنے کے لیے دہلی، علی گڑھ اور لکھنؤ تک کوشش کی لیکن کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ ہاں اتنا معلوم ہو گیا کہ اردو زبان میں مسلم حضرات کے سولہ ترجمے موجود ہیں۔

یوں تو راقم کے پاس سنسکرت اور ہندی کے علاوہ اردو کے پندرہ ترجمے موجود ہیں جن میں سے چار مسلم حضرات کے ہیں۔ ان کے نام اس طرح سے ہیں:

''دل کی گیتا'' آزاد بک ڈپو ہال بازار امرت سر، مطبوعہ جمال پریس دہلی، اس پر سن اشاعت درج نہیں۔ ''نغمۂ جاوید'' از نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی، راج محل پبلیشرز جموں و کشمیر، ۱۹۴۳ء۔ ''بھگوت گیتا یا نغمۂ خداوندی'' از محمد اجمل خاں، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی میں طبع ہوا)، اشاعت ۱۹۹۲ء۔ ''بھگود گیتا'' از ڈاکٹر شان الحق حقی، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ثمر آفسیٹ پرنٹرز نئی دہلی، سنہ اشاعت ۱۹۹۴ء۔

آگے بڑھنے سے قبل ایک معمولی سی جانکاری دینا چاہتا ہوں کہ بادشاہ اکبر کے عہد میں صرف گیتا جی کا ایک ترجمہ ہی فارسی میں نہیں ہوا تھا، بلکہ کل آٹھ ترجمے ہوئے تھے۔ مہا بھارت کے چھ، رامائن کے ۲۴، بھگوت پران کے گیارہ اور یوگ وششٹھ کا ایک ترجمہ بھی فارسی میں ہوا تھا۔ اسی روایت کو دارا شکوہ نے آگے بڑھایا۔ اس نے ۵۲ اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کروایا (۲)۔ اکبر کے دور کے یوگ وششٹھ کے ترجمے کو اس نے درست نہیں سمجھا لہٰذا اس کا دوبارہ ترجمہ حبیب اللہ سے کروایا۔

قدیم کا بھارت ورش ایک وسیع ملک ہی نہیں تھا بلکہ ایک وسیع النظیر دیش بھی تھا۔ منگول، تاتار، افغان، ایران اور ترکی قومیں حملہ آوروں کی حیثیت سے یہاں وارد ہوئیں۔ یہاں کی مٹی کی تاثیر ہی کچھ ایسی ہے کہ یہ سبھی قومیں یہاں کی ہی ہو کر رہ گئیں۔

عرب سے محمد بن قاسم کے بعد دسویں صدی میں امیر سبکتگین اور محمود غزنوی نے ہندوستان پر یکے بعد دیگرے حملے کیے اور پنجاب تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ غزنی فرماں رواؤں نے لاہور کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور ڈیڑھ سو سال تک (۱۰۳۰ تا ۱۱۸۶ء) یہاں حکومت کی۔ ۱۱۹۳ء میں سلطان شہاب الدین غوری نے دہلی اور قنوج کو فتح کر لیا۔ وہ خود تو یہاں نہیں ٹھہرا البتہ قطب الدین ایبک کو اپنا نائب بنا کر چھوڑ گیا۔ اس نے دہلی کو اپنا دار السلطنت بنایا۔ اس طرح پورا شمالی ہندوستان مسلم حکمرانوں کے ماتحت آ گیا۔ مغلیہ حکمرانوں کے عہد میں دکن بھی قریب ان کے قلم رو میں شامل ہو گیا تھا۔ (۳)

اکبر بادشاہ پہلا ایسا مسلم حکمراں تھا جس نے اپنے دور حکومت میں ہندوستان کے سبھی مذاہب کی طرف توجہ مبذول کی اور ان کی مقدس کتب کے ترجمے فارسی میں کروائے اور ایک دوسرے کو قریب

لانے کی کوشش کی۔اسی روایت کو داراشکوہ نے آگے بڑھایا،مگر اورنگ زیب کے ہاتھوں اس کا جو حشر ہوا اس کا ذکر یہاں کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

انگریز جب شمالی ہند کی تمام ریاستوں پر قابض ہو گئے تو انہوں نے ۱۸۳۵ء میں فارسی کے بجائے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔سرکاری ملازمتوں اور روزگار کی خاطر عوام نے اس زبان کو سیکھنا شروع کیا اور وقت گزرتے گزرتے یہ عوام کی زبان بن گئی۔

اب ہندوؤں و مسلمانوں کی مقدس کتب کے ترجمے اس زبان میں ہونے لگے۔قرآن مجید کے اردو ترجموں و تفاسیر کی شروعات سترہویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوتی ہے۔تفسیر وہابی (قدیم دکھنی اردو) عبدالصمد بن نواب عبدالوہاب خاں جلد (۱۶۳۲ صفحات) کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد) میں موجود ہے۔سترہویں و اٹھارہویں صدی میں ان کی تعداد دس ہے۔انیسویں صدی میں ۵۵ اور بیسویں صدی میں ۴۰ نظر آتی ہے۔(۴)

گیتا جی کے ترجموں کی تعداد کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔شری مد بھگوت گیتا نے عالم انسانیت کو ایک راستہ بتلایا ہے جسے ہم راہ مستقیم کہہ سکتے ہیں۔یہ کسی فرقہ،مذہب و ملت کے لیے مخصوص نہیں،ہر فرد و بشر ثابت قدم رہ کر اس راستے پر گامزن ہو سکتا ہے اور اپنی منزل مقصود جسے ابدی مقام کہا جاتا ہے،پہنچ سکتا ہے۔کسی پہ یہ حکم نافذ نہیں ہوتا کہ وہ کس خطۂ ارض سے تعلق رکھتا ہے اور کس مذہبی پیشوا کا پیروکار ہے۔تمام واعظین دین کا مرکز اور تلقین کا مقصد ایک ہی ہے۔صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی عقل اور عقیدہ پختہ ہو،تب رحمت الٰہی اسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔

گیتا میں بھگوان شری کرشن جی مہاراج ارجن کو مقام معرفت حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔اہل تصوف نے اس مقام تک پہنچنے کے لیے چار منازل کا ذکر کیا ہے اور ان سے گزرنے کو ضروری قرار دیا ہے۔یہ مقام اس طرح ہیں:شریعت،طریقت،حقیقت اور معرفت۔

انانیت کے ساتھ افعال کا سرزد ہونا شریعت کی پیروی اور افعالی تثلیث کی پابندی ہے۔ترک انانیت کے وسیلہ سے صفائی قلب کا حاصل کرنا طریقت ہے اور یہ افعالی تثلیث سے آزادی کی صورت ہے۔قلب مصفا سے حق و باطل کی تمیز کرنا اصل حقیقت ہے اور یہ علمی تثلیث کی پابندی مانی جاتی ہے۔ترک پندار سے سکون قلب پیدا کرنا منزل معرفت ہے جہاں علمی تثلیث سے راست گاری ہے۔(۵)

اب ان شعرا و ادبا کے خیالات ملاحظہ فرمائیں کہ انہوں نے ہندوؤں کے اس مقدس صحیفے کا اردو میں ترجمہ کرنے کا انتخاب کیوں کیا؟ سب سے پہلے خواجہ دل محمد صاحب کی بات سنیے، انہوں نے تعارف کا عنوان یوں قائم کیا ہے:

''گیتا اور اس کی تعلیم عرفان کی پھول مالا۔

شری مدبھگوت گیتا دنیا کی قدیم روحانی کتابوں میں بے نظیر اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا مضمون شری کرشن جی مہاراج کا وہ اُپدیش ہے جو انہوں نے ارجن کو کوروکشیتر کے میدان میں مہابھارت کی جنگ کے وقت دیا، جس میں انہوں نے بتایا ہے انسان کیا ہے؟ روح کیا ہے؟ خدا کیا ہے؟ بھگتی اور وصال باری کیوں کر حاصل ہو سکتے ہیں؟ انسان کے فرائض کیا ہیں؟ نشکام کرم یعنی بے لوث عمل کا کیا درجہ ہے؟ یہ عرفانی مضمون سنسکرت کے سات سو اشلوکوں میں بیان کیا گیا ہے۔ ہر اشلوک معرفت کا رنگین پھول ہے۔ انہی سات سو پھولوں کی مالا کا نام گیتا ہے۔

یہ مالا کروڑوں انسانوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے لیکن تا حال اس کی تازگی، اس کی نفاست، اس کی خوشبو میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ پھول اس باغ سے چنے گئے ہیں جس کا نام گلشن بقا ہے، جسے آب حیات نے سینچا ہے اور جس پر حسن کی اس ملکہ کا راج ہے جس کا نام حقیقت ہے۔ اس پھول مالا میں عجب خوشبو ہے اور اس خوشبو میں عجب تاثر۔

اس مالا کو پہنو تو دل و دماغ پر لاہوتی تاثرات چھا جاتے ہیں۔ اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں آفتاب جھلکنے لگتے ہیں۔ ہر خار پھول بن جاتا ہے اور ہر پھول فردوس نگاہ۔ عالم تمام تجلی گاہِ ربانی نظر آنے لگتا ہے۔ جسم کا تودۂ خاکی نور کی مورت بن جاتا ہے۔ دل پر ایک روحانی سکون چھا جاتا ہے اور اس پھول مالا کی ہر پتی کتاب عرفان کا ورق بن جاتی ہے۔

آؤ آج ہم بھی اس کتاب عرفان کے چند اوراق کا مطالعہ کریں، شاید حقیقت کے کچھ رموز ہم پر بھی روشن ہونے لگیں''۔ (ص ۳ و ۴)

تمہید میں محمد اجمل خاں کیا لکھتے ہیں۔ وہ ملاحظہ فرمائیں:

''دنیا کے ادبیات میں گیتا کا درجہ نہایت ہی پر شوکت اور بلند ہے اور اس کا یہ درجہ اس وقت تک قائم رہے گا، جب تک انسان ان چیزوں پر غور کرتے رہیں گے۔ جو اس کے تجربہ،

احساسات اور مادے سے بالاتر ہیں۔ جب تک دنیا میں روح اور روحانیت کا چرچا ہے۔اس وقت تک خدا کا نام لینے والے یقیناً اس تقریر آتشیں اس ترانۂ سرمدی اور اس جلوہ نمائے خداوندی کا مطالعہ کرتے رہیں گے"۔(ص ۳۳)

بھگوت گیتا یا نغمۂ خداوندی محمد اجمل خاں کا نثری ترجمہ ہے۔انہوں نے ہر ادھیائے کے ہر اشلوک کا عام فہم زبان میں ترجمہ کیا ہے۔قاری کو اسے پڑھنے میں کسی قسم کی کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ انہوں نے اکثر مقامات پر مولانا روم، حافظ، شبستری اور عطار کے کلام کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ کہیں کہیں انہوں نے قرآنی آیتوں کو بھی درج کیا ہے تاکہ بھگوت گیتا کی تعلیم اور اسلامی تعلیم کی ہم آہنگی واضح ہوجائے۔

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے گیتا جی کا ترجمہ کہاں اور کن حالات کے زیر اثر کیا، خود ان کی زبانی سنیے:

"میں نے بی اے میں جو مضامین لیے ان میں فلسفہ بھی تھا۔اسی سلسلے میں گیتا کا مطالعہ کیا اور اس کے بلند مطالب و مقاصد نے اپنا گرویدہ بنالیا۔ بعد ازاں گیتا کے متعدد ترجمے اور شرحیں پڑھتا رہا۔لیکن اس طرف خیال بھی نہ کیا کہ اردو میں اس کے ترجمے کی جسارت کروں۔ ۴۳ء کے موسم بہار میں دوران قیام سری نگر (کشمیر) لالہ جویلی رام صاحب چیف سکریٹری ریاست جموں و کشمیر نے جن سے اکثر علمی و ادبی گفتگو ہوا کرتی تھی، بسبیل تذکرہ کہا کہ اگر گیتا کے فلاں ادھیائے کا اردو میں ترجمہ کرو تو بہت اچھا ہو۔ میں نے اپنے عجز کا اظہار کیا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ایک دن گیتا پڑھ رہا تھا کہ لالہ صاحب کی فرمائش کا دھیان آیا، اس وقت تک بھول چکا تھا کہ کس ادھیائے کے ترجمہ کو کہا تھا، پہلے ادھیائے سے ابتدا کی، توفیق رفیق ہوئی اور شعر نکلنے لگے، اگر حافظہ غلطی نہیں کرتا تو پہلا ادھیائے ایک ہی نشست میں ختم ہوگیا اسی کے ساتھ یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ آگے بڑھ کر بعض مقامات ایسے آئے کہ گھنٹوں سر کھپانے پر بھی ایک مصرعہ موزوں نہ ہوتا تھا۔لیکن سرچشمۂ فیض جاری ہوجاتا اور میں بقدر ظرف سیراب ہوتا۔ چھ سات ہفتوں میں ترجمہ ختم ہوگیا۔ ایسے حضرات کو جو گیتا کی تعلیم نیز سنسکرت زبان سے واقف تھے ترجمہ کے اکثر حصے سنائے، انہوں نے نہ صرف ہمت بڑھائی بلکہ اہم اور مفید مشورے بھی دیے"۔(عرض مترجم، ص ۲۵)

اس اقتباس میں دو باتیں خاص توجہ طلب ہیں:

’’ایک دن گیتا پڑھ رہا تھا‘‘ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اثر صاحب اکثر گیتا جی کا مطالعہ کیا کرتے تھے اور انہیں اس صحیفۂ مقدس سے لگاؤ تھا۔ ’’بعض مقامات ایسے آئے کہ گھنٹوں سر کھپانے پر بھی ایک مصرعہ موزوں نہ ہوتا تھا لیکن سرچشمۂ فیض جاری ہوجاتا اور میں بقدر ظرف سیراب ہوتا‘‘۔ ایسا تب ہوتا ہے جب انسان کو کسی چیز سے جذباتی لگاؤ ہو۔ نورالٰہی کی یہ عنایت ہے کہ جس کام کو کرنے کے لیے آپ نیت باندھتے ہیں وہ ہوکر رہتا ہے۔

دل محمد، محمد اجمل خاں اور اثر صاحب کے ترجمے ہندوستان کی تقسیم سے قبل کے ہیں۔ ڈاکٹر شان الحق حقی کا ترجمہ بیسویں صدی کی آخری دہائی کا ہے۔ حقی صاحب کی ولادت ۱۵؍ستمبر ۱۹۱۷ء کو دہلی میں ہوئی، تعلیم سینٹ اسٹیفن کالج دلی اور علی گڑھ سے مکمل کی۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے اور کراچی کو اپنا مسکن بنایا۔ وہ ترقی اردو بورڈ (پاکستان) کے سترہ برس تک اعزازی سکریٹری رہے اور ان کی نگرانی میں اردو ڈکشنری کی کئی جلدیں شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب کا بھگوت گیتا کا ترجمہ پاکستان کی سرزمین کے شہر کراچی پہ ظہور میں آیا۔ یہ کتنی عظیم بات ہے۔ انہوں نے اسی شہر میں بیٹھ کر چانکیہ کے ارتھ شاستر کا بھی اردو ترجمہ کیا۔

(باقی)

حوالے

(۱) فن تحریر کی تاریخ، از محمد اسحاق صدیقی، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، ص ۲۹۔ (۲) ’’شری مد بھگوت گیتا با تصاویر‘‘ موسوم بہ فلسفۂ الوہیت، پانچواں ایڈیشن ترمیم شدہ ۱۹۲۲ء، مولفہ رائے بہادر پنڈت جانکی ناتھ صاحب مدن دہلوی، رام نرائن پریس، متھرا میں بابو رادھا من بھارگو کے اہتمام سے چھپی، ص ۴۷۔ (۳) فیروز اللغات، جے ایس بسنت سنگھ اینڈ سنز چوڑی والان، دہلی ۱۹۸۲ء، ص ۹۹۔ (۴) اردو دنیا، نئی دہلی، جولائی ۲۰۱۳ء، ص ۲۳۔۲۲۔ (۵) شری مد بھگوت گیتا با تصاویر، مترجم پنڈت جانکی ناتھ مدن دہلوی، اشاعت ۱۹۲۲ء، دیباچہ طبع چہارم، ص ۲۔

اخبار علمیہ

''آب زر سے مرقوم تاریخی مصحف مراکش پر اسرائیل کا ناجائز قبضہ''

یہودا نامی ایک یہودی نے قیام اسرائیل سے قبل اسلامی مخطوطات جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔اس نے دمشق، القدس سمیت مختلف شہروں سے معمولی قیمت پر متعدد تاریخی مخطوطات حاصل کر کے اپنی لائبریری بنائی تھی۔اب یہ لائبریری نیشنل لائبریری آف اسرائیل کا حصہ ہے جس کو میوزیم میں ''مجموعہ یہودا'' کے نام سے الگ رکھا گیا ہے۔گذشتہ دنوں نیشنل لائبریری کی جانب سے جاری تاریخی کتابوں کی نمائش میں آب زر سے لکھا ہوا ایک ہزار برس قدیم قرآنی نسخہ شائقین کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا۔اس نسخہ کے متعلق رپورٹ میں یہ بات درج ہے کہ یہ مصحف مراکشی بادشاہ ابوالحسن معروف بہ سلطان الکحل نے خود لکھ کر سلطان صلاح الدین ایوبی کے فرزند سلطان افضل کو ہدیۃً پیش کیا تھا جس کو دوسری اشیاء کی طرح سلطان نے مسجد اقصیٰ کو وقف کر دیا تھا۔مسجد اقصیٰ کے لیے وقف یہ تاریخی مصحف برسوں پہلے گم ہو گیا تھا۔اب اسے اسرائیل انتظامیہ نے نمائش کے ساتھ ساتھ لائبریری کی ویب سائٹ پر بھی ڈال دیا ہے۔ جس کو مراکش کی ڈیجیٹل لائبریری کے ڈائریکٹر عبدالصمد بلکبیر نے ڈاؤن لوڈ کر کے اپنی سائٹ پر ڈال دیا۔ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کا تاریخی ورثہ حاصل کر کے پھر اس کی نمائش کرنا اسرائیل کا ہتھکنڈا ہے جو مسلمانوں کو یہ پیغام دیتا ہے کہ تمہارا علمی ورثہ بھی ہم حاصل کر چکے ہیں۔انہوں نے مزید کہا کہ زمانہ قدیم سے مختلف اسلامی ممالک کے حکمرانوں کی روایت رہی ہے کہ وہ نادر و نایاب اشیاء حرمین شریفین کی طرح مسجد اقصیٰ کو بھی ہدیہ کرتے رہتے تھے۔مسجد اقصیٰ کی لائبریری کے ڈائریکٹر رضوان عمرو کے بیان کے مطابق یہ ہدایا مسجد اقصیٰ کے مکتبہ میں محفوظ تھے۔تاہم اسرائیلی قبضہ کے بعد بیشتر حصہ صہیونی انتظامیہ ہتھیا چکی ہے۔ان میں صرف مخطوطات کی تعداد ۴۰ ہزار ہے۔مسجد اقصیٰ میں اب صرف ۸ ہزار مخطوطات رہ گئے ہیں۔مراکشی مصحف کے علاوہ قرآن کریم کے کئی نادر نسخے بھی اسرائیلی لائبریری میں موجود ہیں۔انہوں نے مزید کہا کہ جب ہم نے اس کتب خانہ کی ویب سائٹ دیکھی تو حیران رہ گئے کہ علامہ ابن تیمیہ کی ''حدوث العالم'' عقیدہ پر ایک کتاب جس کا ایک ہی نسخہ تھا اور جو عدم دستیابی کے سبب اب تک چھپا نہیں تھا اسرائیل کی نیشنل لائبریری میں موجود ہے۔خبر ہے کہ مراکشی پروفیسر احمد ویحمان

اپنے احباب کے ہمراہ ایک مہم اس مقصد سے چلا رہے ہیں کہ حکومت مراکش کو مجبور کیا جائے کہ وہ مذکورہ تاریخی مصحف سمیت بقیہ تمام قیمتی مراکشی نوادر کو اسرائیل سے واپس لے۔ اس کے علاوہ بعض متحرک عرب صارفین نے سوشل میڈیا میں اسلامی ممالک پر زور دیا ہے کہ یہ معاملہ اقوام متحدہ میں اٹھائیں اور اسرائیل سے اپنا ورثہ واپس لیں۔ اس لیے کہ اس حوالہ سے عالمی قوانین موجود ہیں اور کئی ممالک اپنا ورثہ دوسرے ممالک سے واپس لے چکے ہیں۔ (منصف حیدرآباد ص ۶، ۴؍جنوری ۲۰۱۹ء)

''قصتیہ۔ ایک عرب حکمراں کی نامکمل خودنوشت''

دبئی، متحدہ عرب امارات کا ایک اہم ملک ہے۔ محمد بن راشد المکتوم اس کے حکمراں اور متحدہ عرب امارات کے نائب صدر و وزیر اعظم ہیں۔ انھوں نے اپنے ملک و قوم کی خدمت کے ۵۰ سال کی تکمیل پر اپنی خدمات اور یادوں پر مشتمل ''قصتیہ'' نام سے ایک غیر مختتم خودنوشت تحریر کی ہے۔ اس میں ان کے ۵۰ مقالات ہیں، صحرا میں زندگی کے مضبوط عزائم کی عکاسی کرنے والی ان کی تحریر میں حکومت اور خاندان بالخصوص ایرکنڈیشن اور ہوائی جہاز کے ذریعہ سفر سے قبل کی حالت زندگی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ کتاب کو پڑھنے کے بعد ابن مکتوم میں خداداد صلاحیتوں کی حامل شخصیت کی جھلک، فلسفہ و شاعری سے خصوصی دلچسپی، عمیق غور و فکر پر مبنی تحریر اور اسلوب بیان میں سادگی، برجستگی اور شستگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں ماں کا عظیم مرتبہ ہے۔ ایک حکمراں ہوتے ہوئے بھی ان کا یہ جملہ کہ ''میری ماں اور اس کی مسکراہٹ ہی میری اصل زندگی ہے''۔ ماں سے متعلق ان کے قابل قدر جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی طرح ان کا یہ لکھنا کہ ''میں نے اپنے دادا سے اپنی زندگی میں پہلا سبق یہ سیکھا کہ دوسروں کی خدمت کرنا ہی زندگی ہے''۔ انسانیت کے تئیں ان کی مثبت سوچ اور اسلاف کی روایتوں کو مضبوطی سے تھامے رہنے کی عادت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ رپورٹ میں اس کی اشاعتی تفصیلات درج نہیں ہیں۔ (سیاست حیدرآباد، ص ۴، ۱۴؍جنوری ۲۰۱۹ء)

''ان سائٹ کی مریخ پر کامیاب لینڈنگ''

ان سائٹ، ناسا کا خلائی روبوٹ ہے۔ اس کے متعلق اطلاع ہے کہ وہ مریخ پر کامیابی سے اتر گیا ہے۔ مریخ پر خلائی گاڑیوں کے اترنے کے ماضی کے تجربات تشویش ناک تھے۔ ۲۰۱۲ء کے بعد

اس سیارہ پر اترنے والا یہ پہلا روبوٹ ہے۔ وہاں پہنچ کر اس نے ہر اسٹیج اور ہر ایک میٹر کی صورت حال کے بارے میں رپورٹ واپس بھیجی ہے۔ یہ مریخ کی فضا میں گولی کی رفتار سے داخل ہوا۔ اس دوران درجۂ حرارت کو قابو میں کرنے والی چادر، پیراشوٹ اور راکٹ کی مدد سے اسے بحفاظت اترنے میں مدد ملی۔ اب اسے انتہائی سرد موسم میں اپنی بقا کے لیے شمسی پینلز کھولنا اور مکمل طور پر توانائی پیدا کرنے والے نظام کو چلانا شروع کرنا ہوگا۔ مریخ پر ماضی میں بھیجے جانے والے روبوٹس سے اس لحاظ سے یہ منفرد ہے کہ اس کے ساتھ بریف کیس سائز کے دو مصنوعی سیارچے بھی پہنچے ہیں۔ اس کا مقصد یہ پتہ لگایا جانا ہے کہ مریخ کا اندرونی ڈھانچہ زمین کے اندرونی ڈھانچہ سے مماثلت رکھتا ہے یا نہیں۔ ان سائٹ کا ایک بازو انتہائی احتیاط سے سائزمومیٹر سیارے کی سطح پر رکھے گا جس کا کام اس سطح کے نیچے موجودہ کی تحقیق کرنا ہوگا۔ یہ آلہ مریخ پر گرنے والے شہاب ثاقب کے سگنلز کی تفتیش اور یہ بھی معلوم کرے گا کہ مریخ پر زلزلے آتے ہیں یا نہیں۔ ماضی میں اپولو کے خلا بازوں نے چاند پر زلزلوں کے حوالہ سے معلومات جمع کرتے وقت اس سے ملتی جلتی تکنیک استعمال کی تھی۔ ان سائٹ کا حرارتی پروب ایچ پی تھری سطح مریخ پر پانچ میٹر نیچے جاکر یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ اس کے اندرونی ڈھانچے سے کتنی یونائی خارج کی جارہی ہے اور یہ کیسے وجود میں آیا۔ (اخبار مشرق نئی دہلی ص ۶، ۲۶ر دسمبر ۲۰۱۸ء)

”ریورس سلوپ۔ ایک عجیب عارضہ“

ایک خبر کے مطابق جنوب مشرقی چینی علاقہ ژیامن میں مقیم مس چین نامی خاتون کو ایک رات قے اور کانوں میں سیٹیاں بجنے کی شکایت ہوئی۔ صبح بیدار ہوئی تو مردوں کی آواز اس کے لیے ناقابل سماعت تھی۔ اسپتال گئی تو ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ ”ریورس سلوپ“ کے مرض میں مبتلا ہے۔ جس میں انسان کم فری کوئنسی کی آواز نہیں سن پاتا۔ اس عارضہ میں اب تک پوری دنیا میں ۳ ہزار افراد مبتلا ہوئے ہیں۔ اس کے شکار مریض مردوں کی آواز اس لیے نہیں سن پاتے کیونکہ مرد دھیمی فری کوئنسی میں بات کرتے ہیں، اس کے بالمقابل خواتین کی آواز میں لوچ کے سبب فری کوئنسی بلند ہوتی ہے۔ ماہرین اس کے متعدد اسباب کی نشان دہی کرتے ہوئے اس مریضہ کے متعلق کہا کہ وہ شدید ذہنی دباؤ اور نیند کی کمی کا شکار تھی جس کی وجہ سے یہ عارضہ پیدا ہوا اور اسے جلد دور کیا جاسکتا ہے۔ (انقلاب وارانسی ص ۱۱، ۱۷ر جنوری ۲۰۱۹ء)

ک۔ص اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد

تذکرۂ علماے ہندوستان
مصنفہ بدایونی، مرتبہ نورانی

ڈاکٹر عارف نوشاہی

۱۹۶۱ء میں جب محمد ایوب قادری (۱۹۲۶-۱۹۸۳ء) نے مولوی رحمان علی ناروی (۱۸۲۹-۱۹۰۷ء) کا تصنیف کردہ تذکرۂ علماے ہند فارسی سے اردو میں منتقل کر کے اپنے شاندار مقدمے، حواشی اور اشاریے کے ساتھ شائع کیا تو وہ نہ ڈاکٹر تھے نہ پروفیسر، بلکہ سادہ بی اے تھے۔ لیکن کام ایسا جاندار تھا کہ ڈاکٹر اور پروفیسر حضرات بھی اس پر رشک کریں۔ میں نے یہ اشاعت اپنی نوجوانی اور طالب علمی کے دور میں ستّر کی دہائی میں دیکھی تھی اور اسے ترجمہ کردہ تذکرے کی تدوین کا ایک عمدہ نمونہ پایا۔ اس بات کو اب ۲۰۱۹ء آتے آتے ۵۸ برس بیت گئے۔ اس دوران علما کے کئی پرانے تذکرے تدوین ہوئے، کچھ نئے تذکرے بھی لکھے گئے اور شائع ہوئے۔ ہر ایک کی افادیت اپنی جگہ پر مسلم ہے، لیکن قادری صاحب کے معیار کو کوئی نہ پہنچ سکا۔ ۲۰۱۸ء ختم ہونے کو آرہا تھا کہ ستمبر میں سید محمد حسین بدایونی (م: ۱۹۱۸ء) کے مصنفہ مظہر العلماء (تذکرہ علمائے ہندوستان) مرتبہ ڈاکٹر خوشتر نورانی کی بیک وقت ہندوستان اور پاکستان سے اشاعت ہوئی۔ تذکرہ مجھ تک بھی پہنچا۔ یہ اشاعت دیکھ کر قادری صاحب کی یاد تازہ ہوگئی۔ ایک تو تدوین تذکرہ کے حوالے سے اور دوسرا، یہ قادری صاحب ہی تھے جنھوں نے مظہر العلماء کو سب سے پہلے علمی دنیا سے متعارف کروایا تھا۔ بہر حال خوشی ہوئی کہ ایک عمر بتانے کے بعد، معنوی اور صوری محاسن سے آراستہ ایک عمدہ تذکرہ دیکھنے کو ملا ہے۔

یہ تذکرہ جسے اس کے مصنف مولانا سید محمد حسین سید پوری بدایونی (۱۲۷۸-۱۳۳۶ھ؟/ ۱۸۶۲-۱۹۱۸ء) [اس کے بعد: مصنف] نے مظہر العلماء فی تراجم العلماء و الکملاء سے موسوم کیا تھا، اس کے مرتب ڈاکٹر خوشتر نورانی [اس کے بعد: مرتب] نے اسے سہولت کے پیش نظر

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد۔

تذکرۂ علماے ہندوستان کا عرفی نام دیا ہے (ص ۴۱) اور اب یہ اسی جلی نام کے ساتھ بیک وقت پاکستان اور ہندوستان سے ستمبر ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا ہے۔ پاکستان میں اس کی اشاعت دارالنعمان پبلشرز، اردو بازار، لاہور سے اور ہندوستان میں ادارۂ فکر اسلامی، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی سے ہوئی ہے۔ دونوں اشاعتوں کی ضخامت یکساں یعنی نوسو چوالیس (۹۴۴) صفحات ہے۔ میرے پیش نظر پاکستانی اشاعت ہے لیکن میں نے اپنے کرم فرما ڈاکٹر عطا خورشید صاحب (علی گڑھ) سے رابطہ کرکے تصدیق کرلی ہے کہ دونوں اشاعتوں میں سرِمُو فرق نہیں ہے، سوائے جلد کے رنگ کے۔ پاکستانی اشاعت کی جلد سیاہ رنگ میں ہے، جس نے سرورق پر لگی کسی قدیم عمارت کو بھی سیاہی میں رنگ دیا ہے اور تصویر میں یہ عمارت بالکل نظر نہیں آتی۔ چونکہ دونوں اشاعتیں ایک جیسی ہیں، زیر نظر تبصراتی مقالے میں محولہ صفحات کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔

یہ تذکرہ یکم رمضان ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء) کو شروع ہوکر ۱۲ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ (۱۸۹۹ء) کو اختتام پذیر ہوا (ص ۶۹) اس کے نام مظہر العلما سے اس کی تکمیل تصنیف کا سال ۱۳۱۷ھ ظاہر ہوتا ہے۔ تاہم مصنف جب تک زندہ رہے، اپنے مسودے پر اضافات کرتے رہے۔ مصنف نے اس کی تصنیف کی ابتدا اور تکمیل کا سال ظاہر کرنے کے لیے کئی مادہ ہاے تاریخ نکالے جن کا مرتّب نے ذکر کیا ہے (ص ۷۰)۔ کتاب کے قلمی مسودے پر اس کا ایک نام محیّ التواریخ بھی لکھا ہوا ہے (تصویر ص ۴)۔ اگر ہم اسے عربی قاعدے کے مطابق "محیي التواریخ" پڑھیں تو اس سے ۱۳۱۶ برآمد ہوتا ہے جو اس تذکرے کے تصنیفی دور سے متعلق ہے۔

مصنف نے اپنا مسودہ دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں چھ سو ستتر (۶۷۷) شخصیات کے مفصل حالات ہیں، دوسرے حصے میں بطور تکملہ مزید تین سو تریسٹھ (۳۶۳) شخصیات کے اسما اور چند سطری کوائف لکھے ہیں جن کے حالات مصنف کو نہیں مل سکے۔ کل ملا کر یہ ایک ہزار چالیس (۱۰۴۰) شخصیات کے حالات پر مشتمل ہے۔ ان سب شخصیات کا تعلق برّصغیر (متحدہ ہندوستان)، اور اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی سے ہے۔ ایک اچھی تعداد مصنف کے معاصرین کی ہے۔

یہ اس دور میں ہندوستانی علما کے بارے میں لکھا جانے والا تیسرا عام تذکرہ ہے۔ پہلا مولوی رحمان علی کا تذکرۂ علماے ہند (۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء) اور دوسرا محمد ادریس نگرامی (۱۸۵۸-۱۹۱۲ء) کا

تذکرۂ علمائے حال (۱۳۱۳ھ/ ۱۸۹۵ء)۔فرق یہ ہے کہ مولوی رحمان علی کا تذکرہ، فارسی میں ہے اور اس میں قدیم علما بھی شامل ہیں جب کہ باقی دونوں تذکرے اردو میں ہیں اور متاخرین سے متعلق ہیں۔

مظہر العلما کے مسودے کی چند ایک نقلیں تیار ہوئیں لیکن بالفعل ایک ہی قلمی نقل مرتّب کو دستیاب ہوسکی جو بدایوں کی خانقاہ قادریہ کے کتب خانۂ قادریہ میں موجود ہے اور اسی کی بنیاد پر یہ تذکرہ مرتّب ہوکر اب شائع ہوا ہے۔

مرتّب کی یہ علمی کاوش دراصل ان کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جو انھوں نے شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کو پیش کیا اور اس پر انھیں ستمبر ۲۰۱۷ء میں ڈاکٹریٹ کی سند فضیلت تفویض ہوئی (ص ۴۸) اور اب ایک سال بعد جزوی ترمیم وتبدیلی کے بعد شائع ہوا ہے (ص ۴۸)۔مصنف کا سال وفات 1918ء اور اس تذکرہ کی اشاعت کا سال ۲۰۱۸ء ہے۔یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصنف کے انتقال کو سو سال پورے ہونے پر یہ ان کی حیاتِ نو کا وسیلہ ہے۔صد سالہ برسی منانے کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہوسکتا ہے؟

مرتّب نے اسے چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے جس کا اجمال یہ ہے: ۱۔مصنف کا تعارف (بقلم مرتّب)؛ ۲۔مخطوطہ (مظہر العلما) کا تعارف (بقلم مرتّب)؛ ۳و۴۔مظہر العلما کا متن مع تکملۂ مصنف؛ ۵۔تعلیقات (بقلم مرتّب)؛ ۶۔اشاریۂ اشخاص (بقلم مرتّب)۔یہ سارا کام اس خوش اسلوبی، خوش سلیقگی اور ٹھوس علمی انداز سے انجام پایا ہے کہ پروفیسر محمد اقبال مجددی صاحب بھی اس کی تحسین کیے بغیر نہیں رہ سکے (تقریظ بر پشت جلد)۔یہ بات میں نے اس لیے لکھی ہے کہ مجدّدی صاحب کی نگاہ، بلند اور ناقدانہ ہوتی ہے اور کم درجے کے کام ان کی نظر میں نہیں جچتے۔تذکرۂ علمائے ہند کے ترجمہ و تعلیقات بقلم محمد ایوب قادری کے بعد، علما کے کسی تذکرے کی معیاری تدوین کا یہ گذشتہ نصف صدی میں واحد نمونہ ہے جس پر اس کے فاضل مرتّب، دہلی یونیورسٹی اور پاک و ہند میں اس کے دونوں ناشرین مبارک باد کے مستحق ہیں۔

یہ تبصراتی مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں ایک عمومی تبصرہ اور آرا ظاہر کی گئی ہیں؛ دوسرے حصے میں تدوین/ کتابت/ طباعت کے مراحل میں کتاب میں در آنے والی چند معمولی اغلاط کی نشان دہی کی گئی ہے تاکہ اس کتاب کی آیندہ اشاعت (جو یقیناً ہوگی) میں اگر مرتّب مناسب سمجھیں تو ہماری معروضات کو بھی سامنے رکھیں۔سرِ دست تذکرے میں واقعاتی یا تحقیقی غلطیوں (اگر کوئی ہیں)

سے تعرض نہیں کیا گیا۔

عمومی تبصرہ: -راقم کے خیال میں کتاب کے نام مظہر العلماء فی تراجم العلماء و الکملاء میں لفظ ''علما'' کی تکرار حسن بلاغت سے عاری ہے۔اس کے مقابلے میں مولوی رحمان علی کے تذکرۂ علمائے ہند کا لقب تحفۃ الفضلاء فی تراجم الکملاء زیادہ موزوں ہے اور یقیناً مصنف نے اسی سے متاثر ہوکر اپنی کتاب کا نام رکھا ہے۔

-اس تذکرے کی تصنیف میں خود مصنف کا مقصد یہ تھا کہ وہ ہندوستان میں بارہویں، تیرہویں اور چودہویں صدی کے علما، ادبا اور اولیاے کاملین کی تاریخ لکھیں (ص ۶۹)۔ظاہر ہے مکانی اور زمانی اعتبار سے یہ ایک وسیع موضوع ہے۔مصنف کے دور میں ہندوستان کی جغرافیائی حدود شرقاً غرباً چٹا گانگ سے پشاور تک تھی۔تقریباً اڑھائی ہزار کلومیٹر پر پھیلا ہوا ملک اور اس پر تین صدیوں میں پیدا ہونے والے ہزاروں علما، ادبا اور اولیا کا حصر اور احاطہ کرنا ایک دشوار اور وقت طلب کام تھا لیکن مصنف نے اسے محض ڈیڑھ سال میں انجام دے دیا۔نتیجہ یہ نکلا کہ اس میں ہندوستان میں ان تین صدیوں کے کئی علما، ادبا اور اولیا شامل نہیں ہو سکے۔مصنف کا زور، ہند کے ''علماے اسلام'' کے حالات کی جمع آوری پر رہا (ص ۶۹) اور ادبا اور اولیا اس میں اس طرح جگہ نہ پا سکے جس طرح علما۔ یہاں مصنف کے قلم سے چھوٹ جانے والے ایسے متعدد علما کے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔لیکن اس کا فائدہ تب ہوگا جب کسی کو اس کا تکملہ لکھنا مقصود ہو۔

تدوین متن میں مرتّب کی طرف سے جو مسائل ہمیں نظر آئے، وہ حسب ذیل ہیں:

-یہ تذکرے کا مکمل متن ہے تاہم مرتّب نے کچھ مطالب کو حذف کر دیا ہے۔بعض محذوفات کا اعلان کیا ہے (ص ۴۷۳) لیکن بعض محذوفات غیر علانیہ ہیں اور مرتّب نے اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔ جیسے مقدمۂ مصنف، شجرۂ سادات سید پور (بدایوں) اور قطعۂ تاریخ تصنیف از منشی محمد عزیز خان اوجھیانوی۔تدوین متن/ اشاعت کے وقت ان مطالب کو شامل نہ کرنے کا مجھے کوئی علمی جواز نظر نہیں آتا، جب کہ مرتّب مصنف کے مقدمے کا بار بار حوالہ بھی دیتے ہیں (ص ۶۸، ۶۹، ۷۷)۔

-مرتّب نے صفحہ ۵ پر اپنے زیر استعمال مخطوطے کے جس صفحے (۲۲۷) کا عکس چھاپا ہے اس پر مولانا محمد عادل کان پوری کے حالات ہیں۔اگر مخطوطہ میں درج عبارت کو مرتّب کی تدوین کردہ عبارت

(ص ۳۴۸-۳۴۹) سے ملایا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مصنف نے اشخاص کے احترام کے لیے لفظ "صاحب" کا استعمال کیا ہے، لیکن مرتّب نے اسے ترک کر دیا ہے۔ یہی حال اس صفحے پر درج چند دعائیہ کلمات کا بھی ہے۔ مصنف نے "شاہ مقبول احمد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ" لکھا ہے لیکن مرتّب نے "رحمۃ اللہ علیہ" نقل نہیں کیا۔ اسی صفحے پر مصنف نے صاحب ترجمہ کے لیے "سلمہ اللہ" نیز مظہر الحق الہ آبادی کے ترجمے میں بھی مصنف نے "سلمہ" لکھا ہے (مخطوطہ: ص ۲۵۲) لیکن مرتّب کے متن میں ہمیں وہ بھی نظر نہیں آتا۔ مجھے مرتّب کی عنایت سے مخطوطہ کے صفحات ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۵۲ بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہاں بھی متعدد ناموں کے ساتھ "صاحب" موجود ہے لیکن شائع شدہ متن میں ایسا نہیں ہے۔ "صاحب" اور دعائیہ کلمات ترک کرنے کے اصول کا ذکر ہمیں مرتّب کے "ملاحظات" (ص ۴۱-۴۴) میں نہیں ملتا۔ یا معشوق علی جون پوری کے حالات میں ایک جملہ یوں درج ہوا ہے: "قطعۂ تاریخ وفات من جانب منشی شیخ خادم علی [سندیلوی یہ ہے]" (ص ۳۷۱)۔ مخطوطہ (ص ۲۵۲) میں یہ عبارت اس طرح لکھی ہے: "قطعۂ تاریخ وفات من طبع جناب منشی شیخ خادم علی صاحب مؤلف تاریخ جدولیہ"۔ یعنی مصنف کے الفاظ "مِن طبع جناب" کو "من جانب" پڑھا گیا ہے اور "مؤلف تاریخ جدولیہ" محذوف ہے۔

مرتّب سے متن کی نقل یا قرأت میں جو مزید الفاظ چھوٹ گئے ہیں ان کا ذکر مقالے کے دوسرے حصے میں آئے گا۔ ہم ان کو سہو قرأت، سہو قلم یا غضِ بصر کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

مخطوطہ کا صفحہ ۲۲۷ دیکھ کر مجھے ایک اور الجھن پیدا ہوئی۔ جسے بعد میں مرتّب سے براہ راست رابطہ کر کے دور کر لیا گیا۔ اس کا ذکر بھی تدوین کے نقطۂ نظر سے ضروری تھا۔ واقعہ یوں ہے کہ مخطوطہ کے صفحہ ۲۲۷ پر مولانا محمد عادل کان پوری کے حالات سے پہلے مولانا محمد عابد سندھی کے حالات ہیں۔ لیکن مرتّب کے متن میں مولانا محمد عادل کان پوری کے حالات سے پہلے مولانا محمد ظاہر رائے بریلوی کا ترجمہ ہے۔ مرتّب سے اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ ان کے زیر استعمال مخطوطہ میں بعض شخصیات کے تراجم کا اندراج دو مقامات پر ہوا ہے اور جس مقام پر زیادہ جامع حالات تھے انھوں نے وہاں سے لیے ہیں اور دوسرے مقام کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس بات کا بھی مرتّب کے "ملاحظات" میں ذکر ضروری تھا جو نہیں ہوا۔ لیکن خاص اس معاملے میں ایک اور نکتہ بھی قابل ذکر ہے۔ "محمد عابد سندھی" کا ترجمہ مصنف/ کاتب نے دو مقامات - حرف "ع" اور حرف "م" - پر درج کیا ہے۔ مرتّب نے حرف

''ع'' والے ترجمے کو ترجیح دی اور حرف ''م'' والا ترجمہ چھوڑ دیا۔ نتیجۃً ''محمد عابد سندھی'' کا ترجمہ حرف ''ع'' میں شائع ہوا ہے حرف ''م'' میں نہیں۔ اصولی طور پر اسے حرف ''م'' میں شامل ہونا چاہیے تھا کیونکہ ''محمد'' سے شروع ہونے والے بیشتر نام اسی باب میں درج ہیں (اگرچہ چند نام دیگر مقامات پر بھی درج ہوئے ہیں جیسے محمد ابراہیم۔ الف میں، محمد جعفر۔ جیم میں، محمد دراز۔ دال میں وغیرہ)

۔ مرتّب کی مدد سے مجھے مخطوطہ کا صفحہ ۲۲۵ دیکھنے کا اتفاق ہوا جس پر مولوی محمد صدیق دیوبندی کے حالات ہیں (متن مطبوعہ ص ۳۴۷)۔ مخطوطہ میں مصنف/کاتب نے مولوی صاحب کے ۲۱ شاگردوں کا ذکر جس ترتیب سے کیا ہے (ترتیب کے لیے کاتب نے ہر نام کے ساتھ نمبر لگایا ہے) مرتّب نے اسے پس و پیش کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر مخطوطہ میں آخری نام ''مولوی محمد رمضان'' ہے لیکن مطبوعہ میں ''مولوی قاری عبدالمجید''۔ متن کی تدوین میں اس کا خیال بھی رکھا جانا چاہیے تھا۔

۔ مصنف نے کہیں کہیں اپنے کتابی مآخذ کا ذکر کیا ہے جیسے تذکرۂ علماے ہند از مولوی رحمان علی (ص ۱۶۵)، عمدۃ الصحائف (ص ۳۴۹، ۳۵۴)۔ بہتر ہوتا مرتّب دوسرے باب ''تعارف مخطوطہ'' میں مصنف کے مآخذ پر الگ سے ایک مضمون باندھتے اور ان کا ایک تقابلی جائزہ لیتے۔

۔ مصنف نے متعدد تراجم میں قطعات تاریخ درج کیے ہیں۔ مرتّب نے ان قطعات میں وارد تاریخ تو ہندسوں میں لکھ دی ہے لیکن قطعے میں موجود مادہ تاریخ کو واضح نہیں کیا۔ بہتر ہوتا کہ مادہ تاریخ واوین میں لایا جاتا یا اس کے نیچے لکیر کھینچ دی جاتی۔ اس کی ضرورت اس لیے بھی تھی کہ بعض قطعات سیدھے سادے نہیں ہیں بلکہ شاعر نے اس میں تعمیہ و تخرجہ رکھا ہے جس کی تخریج اور وضاحت مرتّب کی طرف سے حاشیے میں ضروری تھی۔ پورے تذکرے میں اس کی متعدد مثالیں ہیں، میں ص ۳۰۵-۳۰۶ پر مولانا فضل رسول عثمانی بدایونی کی وفات کی تاریخ کے قطعات کی مثال پر اکتفا کروں گا جو اسی نوعیت کے ہیں۔ انوار حسین تسلیم سہسوانی کے قطعہ میں جس شعر سے تاریخ برآمد ہوتی ہے وہ اس طرح ہے:

شد جاہ از حقیقت، ہم حال از طریقت   از فیض شد بلندی، ہم وصف از کرامت

اس سے تاریخ کیسے نکلے؟ مطبوعہ میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا لیکن مخطوطہ میں مصنف/کاتب نے طریقہ بتایا ہے۔ فارسی میں لفظ ''شد'' کا مطلب چلے جانا بھی ہے یہاں شاعر نے یہ مراد لیا ہے کہ حقیقت (۶۱۸) کے اعداد سے جاہ (۹) کے اعداد نکل گئے، طریقت (۷۱۹) کے

اعداد سے حال (۳۹) کے اعداد نکل گئے تو مجموعہ ۱۲۸۹ رہ جاتا ہے یہی تاریخ ہے۔ مصرع ثانی میں بھی اگرچہ طریقہ وہی ہے لیکن یہاں شاعر کو دس عدد کی کمی کا سامنا ہے۔ فیض (۸۹۰) سے بلندی (۹۶) اور کرامت (۶۶۱) سے وصف (۱۷۶) کے اعداد نکالیں تو باقی ۱۲۷۹ رہتا ہے، تاہم مخطوطے میں کاتب نے دونوں مصرعوں کے آگے ۱۲۸۹ ہی لکھا ہے۔ محب احمد عبدالرسول بدایونی اور عبدالمقتدر بدایونی کی کہی ہوئی تاریخیں بھی تعمیہ وتخرجہ کے ساتھ ہیں لیکن تاریخ کی تخریج نہیں ہوئی۔

۔فارسی اشعار اور کہیں کہیں فارسی عبارات کے اقتباسات نقل کرنے میں سہو واقع ہوا ہے۔ اس کی نشان دہی مقالے کے دوسرے حصے میں کی جائے گی۔

۔اتنی بڑی کتاب میں کتابت کی چند غلطیاں باقی رہ جانا ایک طبعی امر ہے۔ آج کل کسی بھی کتاب کو اس سے مفر نہیں ہے۔ اس کی نشان دہی بھی مقالے کے دوسرے حصے میں کی جائے گی۔

۔مرتّب نے زیر نظر کتاب کا چھٹا باب ''وضاحتی اشاریہ'' کے لیے مختص کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ اس میں شخصیات، اماکن اور کتب کا اشاریہ مرتّب ہوا ہے (ص ۴۹)۔ لیکن اشاریے کے مقام پر انھیں وضاحت کرنا پڑی کہ اسے صرف اشخاص تک محدود رکھا گیا ہے (ص ۷۸۳)۔ ایک ایسا تذکرہ جس میں صاحبانِ تراجم کی متعدد کتب کے اسماء آئے ہوں اور بنیادی طور پر یہ ''تذکرۃ المصنّفین و المصنفات'' ہو، اس میں اسماء کتب کا اشاریہ نہ ہونا، بہت بڑا نقص ہے۔ یہی حال اماکن کا ہے۔ ایسے تذکروں کے ساتھ نہ صرف مذکورہ تینوں اشاریوں کا ہونا ضروری تھا بلکہ اس میں مرتّب کی طرف سے مزید متنوع اور جزئی اشاریوں کا اضافہ کر کے کتاب کو مزید مفید بنایا جاسکتا تھا، جیسے تاریخ ولادت یا وفات کے اعتبار سے شخصیات کا اشاریہ، مکانی نسبتوں کے اعتبار سے شخصیات کا اشاریہ، مسلک و مشرب کے اعتبار سے شخصیات کا اشاریہ، مادہ ہاے تاریخ کا اشاریہ وغیرہ۔ ہمیں معلوم ہے کہ برّصغیر کے اکثر ناشر اور اشاعتی ادارے اشاریوں کی اہمیت کو نہیں سمجھتے اور کتاب کی اشاعت میں اسے ایک اضافی بوجھ تصوّر کیا جاتا ہے۔ شاید اس معاملے میں ناشرین کو یہی دشواری درپیش ہو۔

۔مرتّب اہل زبان ہیں۔ ان کی زبان پر گرفت کرنا مجھ ''نااہل زبان'' کو زیب نہیں دیتا۔ لیکن بعض مقامات پر زبان وبیان کے حشو و زوائد موجود ہیں۔ چند مثالیں:

''مدوّن و مرتّب نے تدوین متن کے ضمن میں کسی عبارت کا اضافہ کیا ہے وہاں اس بریکٹ

[ ] کے اندر کیا ہے۔ یہ بریکٹ اس بات کی علامت ہے کہ متن کے درمیان اضافہ یا تصحیح مدوّن و مرتّب کی جانب سے کی گئی ہے''۔ (ص ۴۲) ایک ہی بات دوبار بیان کی گئی ہے۔

''ادب میں سب سے دشوار ترین کام تنقید ہے۔'' (ص ۴۵)، جب صفت تفضیلی ''ترین'' موجود ہے تو ''سب سے'' زائد ہے، یا ''سب سے دشوار'' مناسب ہوتا۔

''قلمی مخطوطے حاصل کیے۔'' (ص ۴۷) مخطوطہ کے ساتھ قلمی زائد ہے۔ مخطوطہ میں قلمی کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ یا قلمی نسخے لکھا جاتا۔

مرتّب نے بعض ایسے انگریزی الفاظ استعمال کیے جن کا اردو مترادف نہ صرف موجود ہے بلکہ رائج بھی ہے:

جن اہم لائبریریوں کا سفر اور وزٹ کیا (ص ۴۷) / دیکھا یا ملاحظہ کیا۔

علمی و تحقیقی اسپرٹ / اسی اسپرٹ کے ساتھ (ص ۵۱) / علمی و تحقیقی جذبے / روح۔

اس ریسرچ ورک (ص ۵۱ مکرر) / اس تحقیقی کام۔

ان کے تنقیدی ایڈیشنز تیار کیے (ص ۶۷) / تنقیدی اشاعتیں۔

جن کے ریفرنس کے بغیر (ص ۶۷) / حوالے۔

۔مرتّب کے مقدمہ، تعلیقات، کتابیات میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا نام متعدد حوالوں سے آیا ہے۔ بعض جگہ وہ ان کا پورا نام اور بعض جگہ صرف ایوب قادری لکھتے ہیں۔ عام بات کرتے یا سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے آدھا نام لینے میں مضائقہ نہیں ہے لیکن فہرست ''کتابیات'' میں جہاں جہاں صرف ایوب قادری لکھا ہے (بطور مثال ص ۹۳۶، ۹۴۱، ۹۴۳) مرتّب کو پورا نام محمد ایوب قادری لکھنا چاہیے تھا۔ محمد اقبال مجددی کو بھی صرف اقبال مجددی لکھا ہے (ص ۶۹۷، ۹۴۲)۔

۔مرتّب نے حواشی و تعلیقات نویسی میں تقریباً تین سو مستند تذکرے اور معاصر قلمی نسخے دیکھے (ص ۴۷)۔ ہماری رائے میں مرتّب نے کئی اہم تذکروں کی طرف رجوع نہیں کیا جو پاکستان میں شائع ہوئے ہیں (ممکن ہے وہ ان کے علم یا دسترس میں نہ ہوں)۔ اسی طرح مرتّب نے صرف کتب تذکرہ پر انحصار کیا ہے۔ حالانکہ ایک ایسا تذکرہ ہے جس میں تسلسل کے ساتھ عربی، فارسی اور اردو تصانیف کا ذکر ہوا ہے، اس کے حواشی کے لیے فہارس کتب و مخطوطات سے رجوع کرنا ضروری تھا۔ لیکن ہمیں مرتّب کی

فہرست ''کتابیات''(ص ۹۳۱-۹۴۴) میں ایک بھی کتابِ فہرست نظر نہیں آتی۔ ہندوستان میں جو فہارس کتب و مخطوطات شائع ہو چکی ہیں، ان سے قطع نظر، پاکستان اور غیر ممالک میں چند مفید کتب حوالہ شائع ہوئی ہیں جن میں برّصغیر کے علما اور مصنّفین کی عربی، فارسی، اردو تصانیف کا ذکر ہوا ہے۔ان سے مدد لینا از بس ضروری ہے۔ان سے کتب کے مخطوطہ یا مطبوعہ ہونے کی نشان دہی بھی ہوتی ہے ۔مرتّب کی آگاہی کے لیے ہم چند کتب حوالہ کے اسماء درج کرتے ہیں:

آثارالاولیا،محمد اکرم اکرام،لاہور،۲۰۰۰ء۔ آثارالشعرا،محمد اکرم اکرام،لاہور،۲۰۰۸ء۔

آثارالعلما،محمد اکرم اکرام،لاہور،۲۰۱۶ء۔

برّصغیر کے امامیہ مصنّفین کی مطبوعہ تصانیف وتراجم (اردو کتب)،سید حسین عارف نقوی، اسلام آباد،۱۹۹۷ء، ۲ جلد۔

تذکرہ علما ومشائخ پاکستان وہند،محمد اقبال مجددی،لاہور، ۲۰۱۳ء، ۲ جلد۔

تذکرہ علمائے امامیہ پاکستان،سید حسین عارف نقوی،اسلام آباد، ۱۹۸۴ء۔

تذکرہ علمائے امامیہ،سید حسین عارف نقوی،اسلام آباد، ۱۹۸۲ء۔

تذکرہ علمائے اہلسنت وجماعت (پنجاب)،محمد نذیر رانجھا،لاہور،۲۰۰۹ء، ۲ جلد۔

ثلاثۂ غسالہ(بنگال میں تصنیف ہونے والی عربی،فارسی، اردو کتب)،حکیم حبیب الرحمان، مرتّبہ عارف نوشاہی،لاہور،۱۹۹۵ء۔

دانشنامہ زبان و ادب فارسی در شبہ قارہ،زیر نظر فرہنگستان زبان و ادب فارسی،تہران، ۲۰۰۵-۲۰۱۶ء،اب تک ۵ جلد۔

دانشنامۂ ادب فارسی: ادب فارسی در شبہ قارہ،زیر نظر حسن انوشہ،تہران،۲۰۰۱ء، ۳ جلد۔

فھرس المخطوطات العربیۃ فی باکستان،احمد خان،ریاض،۱۹۹۷-۲۰۱۶ء،۹ جلد۔

فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان،احمد منزوی،اسلام آباد، ۸۳-۱۹۹۷ء، ۱۴ جلد۔

فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان، عارف نوشاہی،تہران، ۲۰۱۷ء، ۴ جلد۔

فہرستوارۂ کتاب ہائے فارسی،احمد منزوی،تہران، ۲۰۰۳-۲۰۱۶ء، ۱۲ جلدیں۔

کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ، عارف نوشاہی،تہران، ۲۰۱۲ء، ۴ جلد۔

معجم المطبوعات العربیه فی شبه القارة الهندیة الباکستانیة منذ دخول المطبعة الیها حتی عام ۱۹۸۰م، احمد خان، ریاض، ۲۰۰۰ء۔

اب ہم اس تبصراتی مقالے کے دوسرے حصے میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں راقم نے صفحہ بہ صفحہ اپنے ملاحظات پیش کیے ہیں۔ یاد رہے کہ ان ملاحظات میں بعض باتیں ممکن ہے قارئین کے لیے بہت معمولی ہوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ مرتّب کے لیے مفید ہوں گی۔

ص ۵۵: ''شہر مشہد [عراق]''۔ کھڑے بریکٹ [] میں اضافہ مرتّب کی طرف سے ہے۔ معروف ترین مقام مشہد، عراق میں نہیں بلکہ خراسان/ ایران میں واقع ہے۔

ص ۵۹: ''مشہور و منطبع می گرداند۔'' درست: مشہود۔

ص ۶۰: ''رخصت دارم۔'' درست: رخصت دادم۔

ص ۶۵: ''ابتداء صوفیہ اور مشائخ کے تذکرے مرتّب کیے''۔ درست: ابتداءً (یعنی تنوین کے ساتھ)۔

ص ۶۶: محمد اسلم پسروی۔ درست: پسروری۔

ص ۶۶: مرتّب نے مجمع النفائس، نتائج الافکار کو اردو شعرا کے فارسی تذکروں میں شمار کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ بنیادی طور پر یہ فارسی شعرا کے تذکرے ہیں۔ اگر ان میں ایسے شعرا کا ذکر ہو گیا ہے جو فارسی کے ساتھ اردو شعر بھی کہتے تھے تو وہ الگ بات ہے۔

ص ۴۷: مرتّب نے دور اول میں فارسی تذکروں میں نثر نگاروں کو نظر انداز کرنے کا گلہ کیا ہے (ص ۴۷)۔ بالعموم یہ بات درست ہے لیکن تیرھویں صدی ہجری میں ہمیں نثر نگاروں کے کم از کم دو مستقل بالذات ہندوستانی تذکرے ملتے ہیں۔ ایک صحائف شرائف (عسکری حسینی بلگرامی) اور دوسرا مجمع الافکار (عبرتی عظیم آبادی)۔

ص ۸۷: کرم گستراخ مارا بنی را۔ مصرع سقیم اور مبہم ہے۔

ص ۱۱۱: سال تاریخ فوت....؛ مرتّب نے اس مصرع میں نقطے لگائے ہیں، لیکن نقطے لگانے کی وضاحت نہیں کی۔ ص ۱۵۸: آغا باقر بہائی۔ درست: آغا باقر بہبہانی۔

ص ۱۶۰: مومن با تولا ہوں۔ تولاّ تشدید کے ساتھ ہوتا تو بہتر تھا۔

ص ۱۶۲: بعزم کوچ زدزیں کو چگہ کوس۔ مرتّب نے کو الگ اور چگہ الگ لکھا ہے۔ اسے ملا کر کوچگہ (کوچ/گہ) لکھا جاتا تو بہتر تھا۔

ص ۱۸۱ سطر ۲۰: لفظ تصنیفات کی ت سطر سے الگ ہوگئی ہے۔

ص ۱۸۹: فراغ حوگلی۔ درست: فراخ حوصلگی۔

ص ۱۹۲: فتوئ جہاد؛ بوجۂ کثرت۔ دونوں الفاظ میں ہمزہ کی بجائے کسرہ کا مقام ہے۔ (ہمزہ کا یہ غلط استعمال اس کثرت سے اردو تحریروں میں ہو رہا ہے، لگتا ہے کچھ عرصے بعد اسے ہی درست تسلیم کرلیا جائے گا اور جو گنے چنے لوگ ایسی ترکیبات میں درست طور پر کسرہ کا استعمال کرتے ہیں انھیں غلط ٹھہرایا جائے گا!!)۔

ص ۱۹۳: پدردارم ہمیشہ مہرباں بود۔ درست: پدر وارم ہمیشہ مہرباں بود۔

ص ۲۰۸: جناب مولوی عبدرب آں/ کہ وقت وعظ دل می شد شکارش۔

دونوں مصرعوں میں سقم ہے۔ شاید اس طرح ہوں:

جناب مولوی عبدالبر آں/ کہ وقت وعظ دل می شد فگارش

ص ۲۲۶: ذرّۂ کی می تواند کردوصف آفتاب۔ ذرّہ کے اوپر ہمزہ لگانا قدیم طریقۂ املا ہے۔ جدید طریقۂ املا کے مطابق اسے ذرّہ ای لکھیں اور پڑھیں گے۔ یہی مسائل ص ۳۹۹ پر الفاظ پیشۂ، کوچۂ اور ص ۷۶۵ علمئ باصفا میں ہیں۔

ص ۲۹۲: برخ کشیدز ابر عدم نقاب۔ یہاں 'ابر' ملا کر اور 'ز' کو الگ کر کے لکھا جانا چاہیے تھا۔

ص ۲۹۵: در ونِ دل۔ درون ملا کر لکھا جانا چاہیے۔

ص ۳۰۴: مسکنش گر دید جنت النعیم۔ گردید ملا کر لکھا جانا چاہیے۔

ص ۳۰۵: برطرز نورقم زدتسلیم سال حلت۔ درست: برطرز نو رقم زد تسلیم سال رحلت۔

ص ۳۰۶: ازسر بر چہار مصرع۔ درست: از سر ہر چہار مصرع۔

ص ۳۱۸؛ ۸۸۵: خواجہ عبیداللہ احراری۔ درست: خواجہ عبیداللہ احرار، خود خواجہ عبیداللہ کا لقب احرار تھا۔ ان سے نسبت رکھنے والے احراری کہلاتے ہیں۔

ص ۳۲۶: ترجمہ دراسات الیبب۔ درست: ترجمہ دراسات اللبیب

ص ۳۴۷: بن سید محمد عطا حسین میرٹھی۔ مخطوطہ کے مطابق: بن حکیم سید محمد عطا حسین میرٹھی۔

ص ۳۴۸: فیض جاری وساری ہے، مخطوطہ کے مطابق: دریائے فیض جاری وساری ہے۔

ص ۳۴۸: خلف مولوی قمرالدین۔ مخطوطہ کے مطابق: خلف الصدق مولوی قمرالدین۔

ص ۳۴۹: خرقۂ خلافت سلاسل خمسہ کی عطا ہوئی۔ مخطوطہ کے مطابق: خرقۂ خلافت سلاسل خمسہ کی عطا فرمائی۔

ص ۳۴۹: اکتساب الثواب ببیان حکم ابدان۔ مخطوطہ کے مطابق: اکتساب الثواب فی بیان حکم ابدان۔

ص ۳۷۱: آپ کی تصنیفات سے... مظہر السالکین۔ درست نام: مظہر السلوکین، یہی نام مخطوطہ کے صفحہ ۲۵۲ اور تذکرہ علمائے حال (طبع محمد اقبال مجددی، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۴۳) میں درج ہے۔

ص ۳۷۱: از دوی بگزشت وگم شد در یکے۔ درست املا اس طرح ہے: از دوی بگذشت وگم شد در یکے۔ دوی کا فصیح املا ''دوئی'' ہے اگرچہ ''دوی'' بھی لکھا ملتا ہے۔

ص ۳۷۱: زین سبب ہاتف یکے کردو گفت۔ یہ مصرع بھی سقیم ہے۔ مخطوطہ کے مطابق یوں درست ہے: زین سبب ہاتف یکے کم کردو گفت

ص ۳۸۰: عزیز خاطر آشفتہ معالاں۔ درست: عزیز خاطر آشفتہ حالاں۔

ص ۳۸۰: کمیت خامہ ام زادہ روانی۔ درست: کمیتِ خامہ ام را دِہ روانی۔

ص ۳۹۴: ز دنیا ہر دو چشم خویش نہفت۔ درست: ز دنیا ہر دو چشم خویش بنہفت۔

ص ۳۹۶: در شریعت بود ماہ برج ماہ دین۔ مصرع سقیم ہے۔ اس طرح درست ہوسکتا ہے:

در شریعت بوہ ماہ برج دین

ص ۳۹۶: نا گہان امر ندا ہی ارجعی۔ درست: نا گہان امر ندای ارجعی۔

ص ۳۹۶: از جماد وعین ششمین/کوئے سوخلد بریں آید نیاز۔

دونوں مصرعوں میں سقم ہے۔ واللہ اعلم پہلا مصرع کیا ہے، دوسرا مصرع یوں لکھا جانا چاہیے:

گوسوے خلد بریں آید نیاز

ص ۳۹۹: جُبہ فرسایش بود شاہ وگدا، شیخ وشباب۔ درست: جُبہ فرسایش بود شاہ وگدا وشیخ وشاب۔

ص ۳۹۹: کےتو اندکردن او فیض بصیرت اکتساب۔ درست: تواند (ملا کر) لکھنا چاہیے۔

ص ۴۰۰: توبہا کردم۔ مروّجہ املا ''توبہ ہا کردم'' ہونا چاہیے۔

ص ۴۰۰: زین سخن از پیر دانش شور وغوغا شد بلند۔ درست: زین سخن از پیر وانش شور وغوغا شد بلند۔

ص ۴۹۶: یہ کتاب۔۔۔ شائع کروایا۔ درست: شائع کروائی۔

ص ۵۴۴: مسکن القوب۔ درست: مسکن القلوب۔

ص ۵۶۴: سال وصل آنشہ والاتبار۔ درست املا: آن شہ۔

ص ۶۹۵: قلعہ مہیا سنگھ۔ درست: قلعہ میہاں سنگھ۔

ص ۶۹۷: ڈاکٹر اقبال مجددی۔ درست: محمد اقبال مجددی۔

ص ۷۳۶، ۷۳۷: بندۂ عشقم وہر دو جہاں آزادم/ نیست بر لوح دلم جز الف قامت/ چہ کنم حرف دگر یاد ندادم استادم۔

یہ تینوں مصرعے دوبار سقیم نقل ہوئے ہیں۔ درست قرأت اس طرح ہے:

بندۂ عشقم وازهر دوجهاں آزادم

نیست بر لوح دلم جز الف قامت دوست

چه کنم حرف دگر یاد نداد استادم

ص ۹۳۶: مرتّب نے تعلیقات نویسی میں تذکرہ علمائے ہند مترجمہ محمد ایوب قادری، طبع اول ۱۹۶۱ء سے استفادہ کیا ہے جیسا کہ ''کتابیات'' سے معلوم ہوتا ہے۔ اس تذکرے کی طبع دوم جو ڈاکٹر خضر نوشاہی اور ڈاکٹر انصار زاہد خاں کی ترمیم وتصحیح کے بعد کراچی سے ۲۰۰۳ء میں طبع ہوئی ہے۔ بہتر ہوتا مرتّب اس کا حوالہ دیتے۔

ص ۹۴۱: فقہائے ہند محمد اسحاق بھٹی مطبوعہ دہلی ۲۰۱۴ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ مرتّب نے جلد کا شمارہ نہیں لکھا۔ پاکستان میں اس کتاب کی پہلی پانچ جلدیں فقہائے ہند نام سے اور آخری تین جلدیں فقہائے پاک وہند نام سے ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور نے شائع کیں۔

ص ۹۴۳: ایشائے غربی۔ درست: ایشیائے غربی۔

آثار علمیہ و تاریخیہ

مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک نادر عربی مرثیہ
جو محسن الملک کی وفات پر لکھا گیا

اشتیاق احمد ظلی

سید الطائفہ مولانا سید سلیمان ندوی اس نظام تعلیم کے سب سے اچھے نمایندہ تھے جو مولانا شبلی کی کوشش اور ان کی نگرانی میں ندوہ میں نافذ ہوا تھا۔اس نظام تعلیم کی ایک بہت نمایاں خصوصیت طلبہ کے اندر عربی زبان وادب کا اعلیٰ مذاق پیدا کرنا تھا۔اس میدان میں اس کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔اس کی بھی سب سے درخشاں مثال مولانا سید سلیمان ندوی تھے۔عربی زبان میں ان کی نثری اور شعری باقیات اس پر شاہد عدل ہیں۔عربی زبان وادب میں ان کی کامل دسترس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ۱۹۰۳ء میں جبکہ وہ ابھی متوسطات کے طالب علم تھے،ندوہ میں محسن الملک کی آمد کے موقع پر ایک عربی قصیدہ پیش کیا تھا(۱)۔افسوس کہ اب یہ کہیں دستیاب نہیں۔۱۹۰۷ء میں عطائے سند کے جلسہ میں انھوں نے خواجہ غلام السیدین کے تجویز کردہ عنوان ''ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہو'' پر عربی زبان میں برجستہ تقریر کرکے سامعین کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔اپنی کوششوں کے اس ثمر(۲) کو دیکھ کر علامہ شبلی کو جو خوشی ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔فرط مسرت سے انھوں نے سر سے عمامہ اتار کر ان کے سر پر رکھ دیا اور خود ان کے بقول ''یہ ان کے واسطے ہمیشہ کے لیے طرۂ افتخار بن گیا''۔(۳)

مولانا سید سلیمان ندوی اردو اور فارسی کے علاوہ عربی میں شعر گوئی پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ ان کے اردو اشعار کا مجموعہ ''ارمغان سلیمان'' تو بہت پہلے پاکستان سے شائع ہوچکا ہے۔البتہ ان کی عربی شاعری کے چند نمونے ہی محفوظ ہیں۔علامہ شبلی کے حادثہ گزندپا کے موقع پر انھوں نے جو عربی نظم لکھی تھی وہ ''حیات شبلی'' میں موجود ہے(۴)۔اس کے علاوہ کچھ نظمیں ''البیان'' اور ''الضیاء'' میں شائع ہوئی تھیں۔ان سب کو ڈاکٹر سطوت ریحانہ نے اپنی کتاب ''عربی زبان وادب کے ارتقاء میں سید سلیمان ندوی کی خدمات'' میں جمع کردیا ہے(۵)۔گو انھوں نے باقاعدہ شاعری نہیں کی لیکن یہ یقین کرنے کے کافی قرائن موجود ہیں

کہ عربی زبان میں یہ سید صاحب کا کل شعری سرمایہ نہیں ہے۔ ممتاز شامی ادیب اور شاعر استاذ عمر بہاء الامیری سید صاحب کے قیام پاکستان کے زمانہ میں وہاں شام کے سفیر تھے۔ ان سے سید صاحب کے دوستانہ مراسم تھے۔ سید صاحب کے خلف الصدق ڈاکٹر سید سلمان ندوی صاحب کی روایت کے مطابق وہ ان کا عربی دیوان دمشق سے اشاعت کے لیے اپنے ساتھ لے گئے۔ لیکن نہ تو اس کی اشاعت ہوئی اور نہ پھر اس کا کچھ پتہ چلا۔ پروفیسر سید ہاشم نے مولانا محمد ناظم ندوی کے حوالہ سے یہی بات کہی ہے البتہ اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔(۶)

محسن الملک کے علامہ شبلی سے گہرے مراسم تھے(۷)۔ اسی تعلق خاطر کی وجہ سے جب وہ ندوہ تشریف لائے تو سید صاحب نے ان کی تہنیت میں ایک عربی قصیدہ لکھا تھا۔ جب ۱۹۰۷ء میں ان کا انتقال ہوا تو انھوں نے ان کا مرثیہ لکھا۔ کچھ ہی پہلے وہ ندوہ سے فارغ ہوئے تھے اور ''الندوہ'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کررہے تھے۔ یہ مرثیہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ۲۶/اکتوبر ۱۹۰۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ محسن الملک کا انتقال ۱۶/اکتوبر کو شملہ میں ہوا تھا۔ چند دن پہلے راقم حروف نے اسے دریافت کیا۔ یہ مرثیہ نہ تو کہیں دستیاب ہے اور نہ ہی اس کا کہیں ذکر ہے۔

مرثیہ عربی

مصنفہ مولوی سید سلیمان صاحب

اسسٹنٹ ایڈیٹر الندوہ

يا عين جودي بدمعٍ سائلٍ هتِنِ جودي ولا تخذليني، لا ولا تِهِني

عيني اسكبي عبراتٍ غيرَ نافدةٍ سكبَ الغمام على عافٍ من الدِّمَنِ

يا شمسُ لا تطلعي بالصبح بازغةً يا ليلُ أظلِم وطُلْ وامتدَّ بالحزَن

وإن أضأتِ فإني عن سناك غني فإنني في دياجيرٍ من الشجن

إنا رُزئنا ببطل من بني مضر يا ليتنا قبل هذا الرزء لم نكن

كيف ترد سهام الموت طائشة لا يتقى من سهام الموت بالجُنَن

تفنى النفوس وإن طال الزمان بها حتى متى تتقي الأخشاب عن سفن

لا يدفع الرَّقْيُ أحداثَ الزمان ولا ينجي الدهاءُ امرأً من هجمة الزمن

كيف اصطبار على هذي رزيتنا هذي رزيتنا من أعظم الفتن

يا أرض شملة لاجادت عليك ولا سقتك مزن من الهطال في الدجن

بموته مات كل الناس إذ جزعوا　　كيف الحياةلإنسان بلا سكن

قامت عليه بواكٍ هنَّ كلُّ قرى　　ناحت على موته كلٌّ من المدن

ما مات من كسبَ الذكر الجميل وإن　　لم يبق في رمسه عظم من البدن

يا محسن الملك لِمْ فارقت مدرسة　　كلية شِدْتَها للقوم والوطن

إن أنت بِنتَ عن الدنيا وساكنها　　فحسن ذكرك عن أذنيه لم يبِنِ

تبقى على رغم أنف الدهر ما ادخرت　　يداك من سمعة أو من ثنا حسن

لما فقدناك عينَ الناس قد دمعت　　عين الشباب وعين الكهل واليفَن

قد استرحت عن الأتراح والحزَن　　وحلّ بالقوم ما حلَّ من المحن

متَّ وما مات ما أحييت من خلُق　　ومن سماح ومن علم ومن سنن

غمضت عينك لا تفتحها أبدا　　لكن عينك لا تغضي كذي الوسن

إن لفضلك وجها لا نراه غدا　　لله وجهك أبرزه من الكفن

يا محسن الملك قم أعداؤنا برزت　　بالنقم فاسلل عليهم صارم اللسَن

يا محسن الملك قم ناديك منعقد　　هم ناظروك فأطرِبْ مصغيَ الأذن

من بعد موتك من ندعو ليُنجدنا　　إذا يصول علينا صاحب الضغن

لما نأيت تركت الناس في الحزَن　　كالجزل من حطب بالنار مقترن

إنا أُصبنا بحبر ماجد فطِن　　زان البلادَ برأي غير ذي أفن

حواشی

(۱) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص ۴۱۹۔ (۲) علامہ شبلی کے انتقال کے وقت سید صاحب نے مرثیہ ''نوحہ استاذ'' کہا تھا۔ اس کا ایک شعر ہے: تیرے فرزندان ندوہ تیری کوشش کے ثمر۔ دیکھیے حیات شبلی، ص ۷۵۹۔ (۳) نفس مصدر، ص ۴۴۷۔ (۴) نفس مصدر، ص ۴۵۶-۴۵۸۔ (۵) دیکھیے ڈاکٹر سطوت ریحانہ، عربی زبان وادب کے ارتقاء میں سید سلیمان ندوی کی خدمات، ناشر مصنفہ، ۲۰۰۲ء، ص ۱۲۷-۱۴۱۔ (۶) سید محمد ہاشم، سید سلیمان ندوی - حیات اور کارنامے، شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۸ء، ص ۲۷۰، مشمولہ عربی زبان وادب کے ارتقاء میں سید سلیمان ندوی کی خدمات، ص ۱۲۸۔ (۷) علامہ شبلی اور محسن الملک کے تعلقات کے لیے دیکھیے ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، علامہ شبلی اور نواب محسن الملک، معارف، دسمبر ۲۰۱۸ء، ص ۴۰۵-۴۲۷۔

وفیات

پروفیسر فواد سزکین

(آخری قسط)

اشتیاق احمد ظلی

۸۔ہسٹری آف سائنسز لائبریری۔کسی بھی معیاری علمی اور تحقیقی ادارہ کے لیے لائبریری رگِ جاں کی حیثیت رکھتی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ ایک اچھی لائبریری کے بغیر کسی اعلیٰ درجہ کے علمی اور تحقیقی ادارہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔معہد تاریخ العلوم العربیہ والاسلامیہ جیسے اختصاصی ادارہ کے سلسلہ میں لائبریری کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔دنیا میں کہیں کوئی اور ایسا ادارہ نہیں تھا جو تاریخ علوم کے لیے مخصوص ہو۔اس خصوصیت کی وجہ سے اس کا معاملہ اس نوعیت کے دوسرے اداروں سے بھی کسی قدر مختلف تھا۔چنانچہ اس موضوع پر بحث و تحقیق کی مخصوص ضروریات دوسری لائبریریوں سے پوری نہیں ہوسکتی تھیں چاہے وہ فرینکفرٹ جیسی اہم یونیورسٹی کی نہایت ثروت مند مرکزی لائبریری ہی کیوں نہ ہو۔چنانچہ ضرورت اس بات کی تھی کہ معہد کے اختصاص اور اس کی علمی اور تحقیقی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک اعلیٰ درجہ کی اختصاصی لائبریری خود معہد کے اندر قائم کی جائے جو اس کے موضوع اختصاص پر اعلیٰ ترین سطح پر بحث و تحقیق کے تقاضے پوری کرسکے۔اس ضرورت کی تکمیل کے لیے پروفیسر سزکین نے معہد میں ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی لائبریری قائم کی۔اس کا اختصاص تاریخ علوم تھا۔اسی لیے یہ ہسٹری آف سائنسز لائبریری کے نام سے موسوم ہوئی۔واقعہ یہ ہے کہ تاریخ علوم کے موضوع اس نوعیت کی لائبریری کہیں موجود نہیں اور کوئی بھی لائبریری اس میدان میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔اس میں ۴۵ ہزار کتابیں اور ۱۰ ہزار مائیکروفلم کا نہایت قیمتی ذخیرہ جمع کیا گیا تھا۔اس بے مثال لائبریری کو پروفیسر سزکین نے اپنے ذاتی وسائل سے بڑی کاوش اور عرق ریزی سے قائم کیا تھا۔کئی کتابوں کا دنیا میں پایا جانے والا تنہا نسخہ یہاں محفوظ ہے۔

عمر کے آخری مرحلہ میں جب ترکی ان کی تگ و تاز کا مرکز بنا اور انہوں نے وہاں استانبول میوزیم آف دی ہسٹری آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی ان اسلام قائم کیا تو اپنے علمی اور تحقیقی کاموں کے لیے اس لائبریری میں محفوظ کتابوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے اس کے ایک حصہ کو ترکی منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کی ضرورت اس لیے بھی محسوس ہوئی کہ اب ان کی مساعی کا مرکز ان کا وطن عزیز تھا۔ اس لائبریری کو انہوں نے اپنے ذاتی وسائل سے قائم کیا تھا اس لیے اس میں تصرف کا ان کو پورا حق حاصل تھا۔ لیکن جرمن گورنمنٹ نے اس استحقاق کو تسلیم نہیں کیا۔ اس نے اس میں محفوظ کتابوں کو جرمنی کا ثقافتی ورثہ قرار دیا۔ اس لیے اس کا کوئی حصہ ملک سے باہر نہیں لے جایا جا سکتا۔ چنانچہ ان کتابوں کو ایرپورٹ پر روک لیا گیا اور پروفیسر سزکین کے خلاف مجرمانہ تفتیش کا آغاز کر دیا گیا (۱)۔ یہ شدید ناانصافی تھی لیکن اس سے اس لائبریری کی غیر معمولی قدر و قیمت کا اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے۔ سیاسی اسباب کی وجہ سے اس وقت جرمنی اور ترکی کے باہمی تعلقات میں شدید تلخی اور کشیدگی پائی جاتی تھی اور یہ غالباً اسی کا شاخسانہ تھا۔ یہ تفتیش جاری تھی کہ پروفیسر سزکین کا پیغام اجل آ گیا۔ اب دونوں حکومتوں کے تعلقات پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ توقع کی جانی چاہیے کہ اب اس معاملہ کا مناسب حل تلاش کر لیا جائے گا۔

۹۔ استانبول میوزیم آف دی ہسٹری آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی ان اسلام۔ جن حالات میں پروفیسر سزکین جرمنی آئے تھے اس کا ذکر ابتدا ہی میں آ چکا ہے۔ یہ واضح ہے کہ یہاں وہ اپنی مرضی کے علی الرغم حالات کے جبر کے تحت آئے تھے۔ قضا و قدر کے فیصلے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اپنی زندگی کے مشن کی تکمیل کے لیے ان کو جرمنی میں جو مواقع میسر آئے وہ ان کو ترکی میں نہیں مل سکتے تھے، خاص طور سے اس عہد کے ترکی میں۔ انہوں نے اپنی لگن اور محنت سے تاریخ علوم کے میدان میں جرمنی کو اس مقام تک پہنچا دیا جو دوسرے ملکوں کے لیے باعث رشک ہے۔ تاریخ التراث کا عظیم سلسلہ یہیں مکمل ہوا۔ اس موضوع اور اس کے متعلقات پر سینکڑوں کتابیں شائع کی گئیں اور وہ معہد قائم کیا گیا جو دنیا بھر میں بے مثال ہے۔ یہیں وہ میوزیم بنایا گیا جو نادرۂ روزگار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے علم و دانش کی جو غیر معمولی خدمت مقدر کی تھی اس کی تکمیل کے لیے ان کو لمبی عمر عنایت کی۔ صحت و عافیت کی نعمت سے فراواں حصہ نصیب ہوا۔ خوش درخشید اور شعلہ مستعجل بھی نہیں تھا بلکہ علم و تحقیق کے آسماں کو ایک طویل مدت تک اپنی

تابانی سے روشن رکھا۔ یہ سب کچھ حاصل کر لینے کے بعد جب وہ مڑ کر اپنے ماضی کی طرف دیکھتے ہوں گے تو یقیناً ایک مسرت آمیز طمانیت کا احساس ہوتا ہوگا۔ شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔ ساتھ ہی دل کے کسی گوشے میں یہ خلش ضرور محسوس ہوتی رہی ہوگی کہ انہوں نے اپنے جاوداں کارناموں سے وطن عزیز کا نام تو ضرور روشن کیا لیکن اپنے ہم وطنوں کی تعلیم وترقی کے لیے کچھ نہ کر سکے اور ان کے لیے کچھ کرنے کی آرزو بھی نہاں خانہ دل میں ضرور چٹکیاں لیتی رہی ہوگی۔ اسی وجہ سے جب وہ اپنے عظیم مشن کی تکمیل کا ایک حد تک سامان کر چکے تو اپنے ہم وطنوں کے لیے کچھ کرنے کا خیال دامن گیر ہوا۔ چنانچہ اخیر عمر میں انہوں نے اپنی توجہ زیادہ تر ترکی پر مرکوز رکھی۔ حسن اتفاق سے اس دوران ترکی کے حالات میں بھی بڑی دوررس اہمیت کی تبدیلیاں راہ پا چکی تھیں۔ جسٹس پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد اب اس طرح کے کام کے لیے حالات سازگار تھے اور حکومت کا تعاون بھی دستیاب تھا۔

اپنے بنیادی مشن کی توسیع کے مقصد سے انہوں نے ترکی میں جو کام کیے ان میں سب سے پہلے فرینکفرٹ میوزیم کے نمونہ پر ۲۰۰۸ء میں استانبول میں ایک میوزیم قائم کیا۔ یہ میوزیم سلطان احمد اسکوائر کے قریب گل خانہ پارک میں قائم کیا گیا۔ گل خانہ پارک شہرۂ آفاق توپ کاپی پیلس کے بیرونی پارک کا حصہ ہے۔ اس میوزیم کا افتتاح ترکی کے وزیر اعظم رجب طیب اردوان نے ۲۵؍مئی ۲۰۰۸ء کو کیا۔ فرینکفرٹ میوزیم کی طرح اس میوزیم میں بھی ان سائنسی آلات اور مشینوں کے ماڈل رکھے گئے ہیں جن کو مسلمان سائنس دانوں نے اپنے عہد زریں میں بنایا تھا۔ فرق یہ ہے کہ فرینکفرٹ کے میوزیم میں ۸۰۰ ماڈل ہیں اور استانبول میں ۷۰۰۔ دوسرا زیادہ اہم فرق یہ ہے کہ فرینکفرٹ میں کچھ اصل آلات بھی ہیں جبکہ استانبول میوزیم میں صرف ماڈل ہیں۔ یہ تمام ماڈل فرینکفرٹ میوزیم ہی کی طرح پروفیسر سزکین کی رہنمائی اور نگرانی میں تیار کیے گئے ہیں۔ اسی میوزیم کے جوار میں پروفیسر سزکین ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یہ ان کی خواہش تھی جس کا حکومت نے احترام کیا۔

۱۰۔ پروفیسر ڈاکٹر فواد سزکین انسٹی ٹیوٹ فار دی ہسٹری آف سائنس ان اسلام: ۲۰۱۳ء میں پروفیسر سزکین نے ترکی میں تاریخ علوم کے موضوع پر مطالعہ وتحقیق کو فروغ دینے کے مقصد سے اس ادارہ کی تاسیس کی۔ اس انسٹی ٹیوٹ کا فاتح سلطان محمد وقف یونیورسٹی سے الحاق ہے۔

۱۱۔ ۲۰۱۳ء ہی میں ہسٹری آف سائنس ڈیپارٹمنٹ اسی مقصد سے قائم کیا۔ یہ ڈیپارٹمنٹ

بھی فاتح سلطان محمد وقف یونیورسٹی سے ملحق ہے۔

۱۲۔ پروفیسر ڈاکٹر فواد سزکین ریسرچ فاؤنڈیشن فار دی ہسٹری آف سائنس ان اسلام: اس نوعیت کے غیر سرکاری اداروں کے تسلسل اور بقا کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان سے متعلق مصارف کی کفالت کا ایسا مستقل اور پختہ انتظام کیا جائے جس کے ذریعہ سال بہ سال ان کی ضرورتیں بھی پوری ہوتی رہیں اور اس میں ان کی توسیع اور ترقی کی بھی گنجائش ہو۔ اسی مقصد سے استانبول کے میوزیم کے لیے ضروری وسائل کی فراہمی کے لیے اس فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا تھا۔ بعد میں جب فاتح سلطان محمد وقف یونیورسٹی میں مذکورہ بالا ڈیپارٹمنٹ اور انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا تو وہ بھی اسی کے دائرہ کار میں آ گئے۔ ان اداروں کی دیکھ ریکھ کے علاوہ اس فاؤنڈیشن کے تحت یہاں زیر تعلیم طلبہ کو اسکالرشپ بھی فراہم کی جاتی ہے۔ انڈر گریجویٹ طلبہ کو ایک ہزار اور پوسٹ گریجویٹ طلبہ کو چودہ سو لیرا اسکالرشپ کے طور پر دیے جاتے ہیں۔ پروفیسر سزکین کی شہرۂ آفاق کتابوں کی فروخت سے جو آمدنی ہوتی ہے اس کو اس اسکالرشپ کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

ان غیر معمولی اور گوناگوں علمی، تحقیقی اور ادارہ جاتی خدمات کا عالمی سطح پر اعتراف کیا گیا اور پروفیسر سزکین کو متعدد اعزازات سے نوازا گیا۔ سب سے پہلے سعودی عرب نے ان کی قدرشناسی کی اور ان کو پہلا قابل ذکر اعزاز وہیں سے دیا گیا۔ موسسۃ الملک فیصل الخیریہ کی طرف سے ۱۹۷۹ء میں جب فیصل ایوارڈ (جائزۃ الملک فیصل الخیریۃ) کی تفویض کا سلسلہ شروع کیا گیا تو جن اسکالرس کو پہلے ہی سال یہ ایوارڈ دیا گیا ان میں پروفیسر سزکین شامل تھے۔ یہ عالمِ اسلام کا سب سے بڑا انعام ہے اور اسلامی دنیا میں اس کو نوبیل پرائز کا ہمسر سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایوارڈ دو ملین ڈالر اور ایک سند پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ انعام پانچ الگ الگ موضوعات پر دیا جاتا ہے، خدمت اسلام، مطالعات اسلامی، عربی زبان و ادب، میڈیسن اور سائنس۔ جب ۱۹۷۹ء میں پہلی مرتبہ یہ انعامات دیے گئے تو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اسلامی خدمات کے لیے اور پروفیسر سزکین کو مطالعات اسلامی کے لیے یہ انعام تفویض کیا گیا۔ پروفیسر سزکین نے اس سے حاصل ہونے والی رقم کو معہد تاریخ العلوم العربیۃ والاسلامیہ کی تاسیس کے لیے استعمال کیا۔

اس کے علاوہ جو اعزازات ان کو دیے گئے ان میں جرمنی کا گرانڈ کراس شامل ہے جو ملک کی

نمایاں خدمت کے لیے دیا جاتا ہے۔مشہور فلسفی اور شاعر گوئٹے فرینکفرٹ میں پیدا ہوا تھا۔ پروفیسر سزگین جس یونیورسٹی سے تاحیات وابستہ رہے وہ اسی کے نام سے منسوب ہے۔اس شہر کے گوئٹے انسٹی ٹیوٹ نے غیر جرمن اسکالرس اور ماہرین کو ان کی خدمات کے اعتراف میں گوئٹے میڈل دینے کی طرح ڈالی۔ یہ میڈل بھی پروفیسر سزگین کو دیا گیا۔ترکی کی حکومت نے ان کو اپنا سب سے بڑا اعزاز ٹرکش پریسیڈنسی کلچر اینڈ آرٹس گرانڈ پرائز تفویض کیا۔ پانچ جلدوں پر مشتمل ان کی کتاب سائنس اینڈ ٹکنالوجی ان اسلام کو ایران نے ۲۰۰۶ء میں سال رواں کی سب سے اچھی کتاب کا ورلڈ پرائز دیا۔ٹکنالوجی یونیورسٹی ملیشیا نے ان کو اعزازی ڈاکٹریٹ تفویض کی اور ان کے نام سے ایک چیئر بھی قائم کی۔جن یونیورسٹیوں نے ان کو اعزازی ڈاکٹریٹ تفویض کی ان میں اتاترک یونیورسٹی،سلیمان دیمرل یونیورسٹی، استانبول یونیورسٹی اور بعض دوسری یونیورسٹیاں شامل ہیں۔ وہ ٹرکش یونیورسٹی آف سائنس، مجمع اللغۃ العربیہ، دمشق، مجمع اللغۃ العربیہ، بغداد اور مجمع اللغۃ العربیہ، قاہرہ کے ممبر تھے۔اس کے علاوہ رائل مراکو اکیڈمی کے ممبر تھے۔ جو اعزازات ان کو دیے گئے وہ کم لوگوں کو دیے گئے ہوں گے لیکن اس امر میں بھی شبہہ کی گنجائش نہیں کہ وہ اس سے کہیں زیادہ کے مستحق تھے۔(۲)

اس غیر معمولی شخصیت کی غیر معمولی داستان حیات ختم کرنے سے پہلے ایک چیز کا ذکر کرنے کا جی چاہتا ہے جس کا ذکر دراصل تاریخ التراث کے ضمن میں آنا چاہیے تھا۔ یہ بات ایک تسلیم شدہ حقیقت کے طور پر مانی جاتی ہے کہ نئی دنیا (امریکہ) کی دریافت کا سہرا کرسٹوفر کولمبس کے سر ہے جو ۱۴۹۲ میں وہاں پہنچا۔ پروفیسر سزگین سے پہلے بھی کئی محققین نے اس دعویٰ کی صداقت کو چیلنج کیا تھا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس خطہ کو کولمبس سے بہت پہلے عرب دریافت کر چکے تھے۔ اس موضوع پر عربوں کی جہازرانی جیسی شہرۂ آفاق کتاب کے مصنف مولانا سید سلیمان ندوی نے ''عرب اور امریکہ'' کے عنوان سے ایک مقالہ معارف میں شائع کیا تھا۔اس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ کولمبس سے بہت پہلے عربوں نے امریکہ کو دریافت کر لیا تھا(۳)۔ پروفیسر سزگین نے اس بحث کو فیصلہ کن مرحلہ میں پہنچا دیا۔انہوں نے پرانے نقشوں اور بے شمار ناقابل تردید شواہد کی بنیاد پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ کولمبس سے سینکڑوں سال پہلے عربوں کے قدم اس خطۂ ارض میں پہنچ چکے تھے۔اس موضوع پر پروفیسر سزگین نے تاریخ التراث کی گیارہویں جلد میں خاصی تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہ جلد جغرافیا اور نقشہ نویسی سے

متعلق ہے۔اس حصہ کا عربی ترجمہ دستیاب ہے۔(۴)

پروفیسر سزکین کے اس مختصر تذکرہ میں طوالت کے اندیشہ سے کئی ضروری چیزوں کا بھی ذکر نہیں آسکا ہے۔یہ سلسلہ ایک مختصر وفیاتی مضمون کے طور پر شروع ہوا تھا اور بہت کچھ سمیٹنے کے باوجود چھ قسطوں پر محیط ہوگیا۔لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ پروفیسر سزکین نے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں مسلمان علماء کے کارناموں کو علم و دانش کی دنیا میں جس طرح گفتگو اور بحث کا موضوع بنادیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔اب کوئی انصاف پسند اسکالر نہ تو مسلمانوں کے عظیم الشان علمی اور سائنسی کارناموں کا انکار کرسکتا ہے اور نہ ان کو علم دشمن کہہ سکتا ہے۔یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے:

داستانِ عہدِ گل را از نظیری باز پرس عندلیب آشفتہ تر گفتست ایں افسانہ را

لیکن کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔پروفیسر سزکین نے اپنے عزم اور جانکاہ کاوش سے جو روایت قائم کی ہے ضرورت ہے کہ اس کو آگے بڑھایا جائے اور اسے پوری طرح مستحکم کردیا جائے۔انہوں نے فرینکفرٹ میوزیم میں رکھے ہوئے ماڈلس کے بارے میں لکھا ہے کہ مسلمان علماء نے جو سائنسی آلات بنائے تھے یہ ان کے ایک فیصد سے زیادہ کی نمایندگی نہیں کرتے (۵)۔اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ابھی کتنا کام باقی ہے۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں ہزار بادہ نا خوردہ در رگِ تاک است

نوٹ: اس مقالہ کے لیے بیشتر مواد معروف محقق ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی صاحب نے فراہم کیا۔اس کے لیے میں ان کا شکر گذار ہوں۔

حواشی

(۱) انگریزی روزنامہ صباح، استانبول، یکم جولائی ۲۰۱۸ء۔(۲) ان امور پر معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ان کی سوانح حیات بھی اس سلسلے میں زیادہ تر خاموش ہے۔اس لیے ان مباحث کے سلسلہ میں ان اداروں کے آفیشیل ویب سائٹ پر بھروسہ کیا گیا ہے۔(۳) شاہ معین الدین احمد ندوی، حیات سلیمان، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، بدون تاریخ، ص ۴۴۲، سید سلیمان ندوی، معارف، نومبر ۱۹۲۶ء، ص ۳۸۶۔۳۸۷۔(۴) اکتشاف المسلمین للقارة الامریکیة قبل کرسٹوفر کولمبس، (مستل من تاریخ التراث العربی) الترجمة والاخراج فرید بن فغول، مراجعة الترجمة مازن عمادی، ۱۴۳۵/ ۲۰۱۴، معہد تاریخ العلوم العربیہ الاسلامیہ فرینکفرٹ۔(۵) مکتشف الکنز المفقود، ص ۶۲۔

آہ! مولانا سید واضح رشید ندوی مرحوم

آہ مولانا سید واضح رشید ندوی ٹھیک فجر کی اذان کے وقت اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ تہجد کے لیے اٹھے، وضو کیا، نماز پڑھی، سپیدۂ صبح کا انتظار تھا کہ ایک ابدی نورانی چادر نے ان کو آغوش رحمت میں ڈھانک لیا، ۱۶/ جنوری بروز چہار شنبہ۔ کچھ ہی دیر میں یہ خبر عام ہوئی اور زندگی کی ناپائیداری اور اجل مسمیٰ پر اعتقاد رکھنے والے بھی کچھ دیر کے لیے یقین نہ کر پائے مگر بالآخر زبان کے ساتھ دل کو اقرار کرنا پڑا کہ سب اللہ کے لیے ہیں تو اللہ ہی کی طرف جانا بھی طے ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا سید واضح رشید ندوی رائے بریلی کے اس خانوادہ حسن کے نمایندہ تھے جس کے تعارف کی ضرورت نہیں، معارف کے صاحب علم و دل مدیر اول نے کبھی لکھا تھا کہ مجدد سرہندی اور مجدد دہلوی کے فضل و کمال اور مجاہدہ و حال کے دو آتشہ سے ایک اور سہ آتشہ تیار ہوا اور وہ یہی رائے بریلی کے سادات حسنی کا خاندان تھا جس میں ان دونوں بزرگوں کی تعلیمات کا فیض آ کر مل گیا تھا۔ اس خاندان کے آسمان فضل و کمال پر حضرت سید احمد شہید اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسے آفتاب و ماہتاب چمکے۔ مولانا واضح رشید ندوی بھی ایسے ہی ستارے تھے، قطب تارے کی طرح سب سے الگ، لیکن روشنی میں کم نہیں۔

مولانا مرحوم ۱۹۳۵ء میں تکیہ رائے بریلی میں پیدا ہوئے، تاریخ ۱۰/ اکتوبر تھی، ان کے والد ماجد سید محمد رشید حسنی، مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کے خویش یعنی ڈاکٹر سید عبدالعلی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بہنوئی تھے۔ ایں خانہ ہمہ آفتاب است، زبان پر آ کر رہتا ہے۔

واضح صاحب نے ندوہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ یہ ایک روایت کی توسیع تھی لیکن انہوں نے عصری تعلیم کے لحاظ سے جب مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا تو یہ بھی گویا ایک خاندانی روایت کی پاس داری تھی۔ دیکھا جائے تو ان کی پوری زندگی میں روایتوں کی ایک بڑی دل کش و دل نواز جامعیت نظر آتی ہے۔ شروع میں وہ آل انڈیا ریڈیو کی عربی سروس کے ذمہ دار رہے اور یہ ان کی جدید عربی

زبان پر مہارت کا گویا اعتراف تھا۔ صرف خبریں ہی نہیں، متنوع پروگراموں کی ترتیب و پیش کش ان کے ذمہ رہی۔ لیکن اصل ذمہ داری تو کچھ اور مقدر میں تھی، شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلویؒ نے اشارہ کیا اور ایک پر کشش اور منفعت عہدہ کو انھوں نے یک لخت ترک کر کے ندوہ کی تعلیمی خدمت کو قبول کر لیا۔ ۱۹۷۳ء میں وہ ندوہ میں عربی زبان و ادب و انشا کے استاد ہوئے اور تب سے اب تک قریب چھیالیس سال کا عرصہ ندوہ کے لیے وقف ہو گیا۔ ان کے ہزاروں شاگرد ہوئے اور ہر شاگرد کو یہی احساس کہ مولانا سب سے زیادہ اس سے محبت کرتے تھے، یہ احساس بجائے خود مولانا کے کمال درس کے ساتھ کمال توجہ و تربیت کی ایک داستان سناتا نظر آتا ہے۔ ان کے شاگردوں کا عام تاثر یہی ہے کہ مولانا نے عربی زبان خواہ وہ کلاسیک ہو یا جدید ترین ادب، ان دونوں میں عربی مضمون نگاری کا شوق مولانا کے انداز درس میں عجب طرح سے نکھرا۔ فن تعلیم و تربیت پر ان کی گہری نگاہ تھی اور یہی مولانا عبداللہ عباس ندوی کی رحلت کے بعد ان کے معتمد تعلیم ہونے کی وجہ رہی۔ اور معتمد تعلیم ہی کیا ان کو علماء، مشائخ، اہل دانش اور صاحبان فکر و نظر کا اعتماد جس طرح حاصل رہا، اس کا اندازہ ظاہری طور پر کرنا مشکل ہے۔ خاموشی، تنہائی، گوشہ گیری، حیا و خفا یہ وہ صفات یا علامات ہیں جو نام و نمود سے دوری اور شہرت طلبی سے بیزاری کا اظہار ہیں، اس کے باوجود مولانا لوگوں کے دلوں میں بستے چلے گئے۔ البعث الاسلامی، الرائد میں ان کی عربی تحریروں کا شمار آسان نہیں، اسی طرح اردو میں وہ برابر قلم و قرطاس سے رشتہ قائم کیے رہے۔ ان کی تصنیفات بھی کم نہیں۔ ادب جاہلی پر ان کی تاریخ الادب العربی گو نصابی ضرورت کے تحت لکھی گئی لیکن یہ عصر جاہلی کا ایک بہترین تنقیدی جائزہ بھی ہے۔ عربی زبان کی خصوصیات اور عربی بولنے والوں کے طبعی و عقلی احوال، ادبی ذوق جیسے موضوعات پر مولانا کے مطالعہ کے نتائج نے اس کتاب کو عربی ادب کی تاریخ کے ساتھ تنقیدی لحاظ سے بھی بہت مفید بنا دیا۔ عربی میں متعدد کتابیں جیسے فضائل القرآن الکریم، فضائل الصلوۃ علی النبیؐ، الدین والعلوم العقلیہ، ادب الصحوۃ الاسلامیہ، حرکۃ التعلیم الاسلامی، الی نظام عالمی جدید، من صناعۃ الموت الی صناعۃ القرارات، حرکۃ رسالہ انسانیہ، الشیخ ابوالحسن قائدا حکیما وغیرہ ہیں۔ اسی طرح اردو میں کئی کتابیں ہیں جو اسلام، تعلیم، تہذیب، فلسطین اور ٹیپو سلطان جیسے موضوعات پر ہیں اور یہ سب مولانا کی گہری نظر اور فکر کی شاہد ہیں۔ مغربی تہذیب و ثقافت کی تباہ کن حقیقتوں کا ادراک، ان کی نشان دہی اور ان کے ازالہ کا سامان مولانا

کی نمایاں ترین فکری متاع تھی۔ مستشرقین کا رد ہو یا مغربی سیاست کی دسیسہ کاریاں، مولانا کا قلم ہمیشہ ان کے تعاقب میں رہا۔ جدید عالم عرب کے فکری و سیاسی مسائل پر اظہار خیال کرنے میں شاید ہی کوئی ان کا ہم سر ہو، ان کی ایک کتاب تاریخ الثقافۃ الاسلامیہ میں مسلمانوں کی تہذیبی و ثقافتی عظمت کی بحث ان کے وسیع مطالعہ کا بہترین نظارہ ہے۔ برادرم ڈاکٹر طارق ایوبی نے اس کو اردو قالب عطا کیا تو مولانا مرحوم کے ایک شاگرد سے کچھ لکھوانے کی کوشش کی، قریب چھ سات سال پہلے جو لکھا گیا وہ آج پھر سامنے ہے کہ:

> "عجیب بات ہے کہ قریب ایک صدی قبل رائے بریلی کے صاحب احترام خانوادہ حسنی کی ایک شخصیت نے عربی زبان میں ہندوستان کی اسلامی ثقافت کے سارے نقوش یکجا کر کے اسلامی ہند کی تاریخ کو تاب دار کیا تھا، حکیم حسنیؒ کے عادات وصفات میں آتا ہے کہ ان کی طبیعت میں خلوت پسندی، وقار، کم گوئی، حیا اور سلامت طبع تھی، نہایت خود دار اور کم آمیز تھے لیکن ساتھ ہی نہایت خلیق، خندہ جبیں اور شگفتہ طبع تھے، سو برس بعد اسی خانوادہ کے ایک فرزند (مولانا واضح رشید ندوی) نے پورے عالم اسلام کی تہذیبی داستان تاریخ الثقافۃ الاسلامیہ میں پیش کر دی..... یہ اتفاق شاید اس لیے بھی کہ مولانا کی سیرت بھی مولانا عبدالحی کی سیرت کی واقعی توسیع ہے، وہی خلوت پسندی، وہی کم آمیزی، وہی کم گوئی اور اس کے ساتھ وہی دردمندی اور اسلامی و انسانی تاریخ پر وہی نظر کی گہرائی"۔

مولانا ایک کارواں تھے ایسے کہ ستارے اس کی گرد راہ بنے لیکن اس کارواں میں اخوت کی جہاں گیری کا منظر شاید سب سے اثر آفریں رہا، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی جیسے بھائی کی شخصیت میں انھوں نے خود کو جس طرح ضم یا گم کیا، اس کو اسی محبت کی فراوانی سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ تعزیت حضرت مولانا مدظلہ اور صاحبزادہ مولوی جعفر مسعود حسنی ندوی ہی سے نہیں، ہم سب تعزیت کے مستحق ہیں۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ۔

ع۔ص

مطبوعات جدیدہ

عظمت شبلی: از مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ، جمع و ترتیب ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی اور محمد معتصم اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۵۲۱، قیمت: ۵۰۰/روپے، پتہ: اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن، نئی دہلی۔

دیکھتے دیکھتے مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے سفر آخرت کو دس سال ہوگئے۔ اسی فروری کے مہینے میں وہ دارالمصنّفین، معارف اور ایک دنیا کو الوداع کہہ گئے تھے۔ یہ اتفاق ہی ہے کہ مطبوعات جدیدہ کے لیے جو کتاب ہاتھ لگی وہ ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ مولانا کی نثر نگاری کا ایک زمانہ معترف رہا، ٹھوس اور ٹکسالی زبان مولانا کی خاص پہچان تھی۔ زیر نظر کتاب نے ایک بار پھر مولانا کی زبان کے ساتھ ان کے مطالعہ کی گہرائی اور معانی تک رسائی کا لطف تازہ کردیا۔ لطف کی اس تازگی میں علامہ شبلی کا روحانی اثر بھی شاید کارفرما ہو کہ موضوع علامہ ہی کی ذات و صفات ہے، مولانا اصلاحی مرحوم نے مختلف موقعوں پر شبلی کے تعلق سے یہ تحریریں سپرد قلم کیں، اس لیے ان میں تنوع اور گونا گونی ہونی ہی تھی۔ علامہ شبلی کی حدیثی نظر، سیرت نگاری، تذکرہ نگاری، ادبی رعنائی، شعر فہمی، تعلیم اور کتب خانوں سے دلچسپی کے تعلق سے قریب اکیس مضامین ہیں۔ ان میں شعر العجم، سفرنامہ روم و مصر و شام، الفاروق اور سیرت النبیؐ کا تجزیہ جس عالمانہ و فاضلانہ اور محققانہ شان سے کیا گیا ہے وہ شبلیات کے خزانہ کے سب سے بیش قیمت حصہ میں رکھنے کے لائق ہے۔ علامہ کی شعر فہمی کے تعلق سے یہ جملہ لطف دے گیا کہ وہ شاعر کتنا خوش قسمت ہے جس کے شعر علامہ کے انتخاب میں آئے، جن شعروں سے عام اور سطحی لوگ سرسری گزر جاتے ہیں، علامہ کا ذہن ان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے اور زمین سے آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔ مولانا اصلاحی کے اسلوب میں عموماً منطقی سنجیدگی اور ثقاہت کے ساتھ خنکی اور نرمی کا احساس ہوتا ہے لیکن شعر العجم کو تنقید کے نام سے جس تنقیص کا نشانہ بنایا گیا، اس کو دیکھ کر مولانا اصلاحی کی زبان پر یہ شعر واقعی مزہ دے گیا کہ نوا سنجیوں نے تری اے انیس۔ ہر اک زاغ کو خوش بیاں کردیا۔ یوں تو ہر مضمون چشم کشا اور دل کشا ہے لیکن سیرۃ النبیؐ کے حوالہ سے جو تعجب خیز تنقیدیں ہوئیں، ایک مضمون میں ان کا جس طرح محاسبہ اور تعاقب کیا گیا وہ اس مضمون کو یادگار بنا گیا۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ شبلی پر اگر عمدہ ترین پانچ کتابوں کا انتخاب کیا جائے تو ان میں یہ کتاب بھی ہوگی۔ لائق مرتبین لائق تحسین ہیں کہ انہوں نے ان

مضامین کو جمع کیا، ان کا یہ کہنا برحق ہے کہ یہ تحریریں مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن یہ لکھنا کہ شبلیات پر لکھنے والوں میں آپ (مولانا اصلاحی) ختم الرسل ہیں، نامناسب تعبیر ہے، پروف ریڈنگ بھی کتاب کے شایانِ شان نہیں ہے۔

جنبشِ لب: از ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۸۳، قیمت: ۳۰۰/روپے، پتہ: البلاغ پبلی کیشنز، اعظمی اپارٹمنٹ، فلیٹ N-I-10، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی اور مکتبہ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ۔

اس خوبصورت مجموعہ کلام کے شاعر کا تخلص نازشؔ ہے لیکن سرورق پر یہ نام درج نہیں، بات صرف اتنی ہے کہ ڈاکٹر اعظمی کو جیسے تنہائی اور عافیت کے گوشوں میں سرگوشیوں کی عادت سی ہے۔ وہ عالم بھی ہیں اور عربی کے ڈاکٹر بھی، سیاسیات میں ایم اے کیا اور شبلی کالج میں شعبۂ عربی کی مسند صدارت کو سرفراز کیا، یوں وہ متورع ہی نہیں متقشف بندۂ مومن ہیں۔ ہونا تو چاہیے تھا کہ ان کا کلام درد و مومن یا امیر و تسنیم کی یاد دلاتا، لیکن آتش کدۂ احساس، روح کا زخم، اقبال جرم، خودکشی، اداس نسلوں کے نام، بوڑھا پیڑ جیسی نظمیں کسی اور ہی شاعر کا پتہ دیتی ہیں۔ اداس نسلوں کا ایک شاعر/ میں ایک دریوزہ گر بھکاری/ مرا مقدر عروج پہ ہے/ اداس نسلوں کا سارا ورثہ/ جمود، نفرت، گھٹن، اداسی/ سسکتے لمحوں کی کرب ناکی/ سب مری جھولی میں آگرے ہیں/ لگتا ہے کہ حسرت موہانی کی شکل میں خلیل الرحمٰن اعظمی، ناصر کاظمی اور شاذ تمکنت محوِ سخن آرائی ہیں۔ شاعر جب خود سے پوچھے کہ وہ عیسیٰ نہیں تو پھر صلیب کیوں مقدر بنی، سقراط بھی نہیں تو زہر کے جام، ہونٹوں کا نصیب کیوں کر بنے، کیوں ہر سانس، نشترِ جاں بن گئی؟ جب احساس کی شدت خود احساس کو جہنم بنادے تو واقعی شاعر محض شاعر نہیں رہتا وہ انجیر کے سایہ میں وہ عرفان پالیتا ہے، جہاں انجیر کا ہر پتہ ماضی کی روایت و پاکیزہ امانت، ماں کی نشانی اور بابا کی علامت بن کر حقیقت کے تمام رازوں سے پردہ اٹھادیتا ہے۔ دکھ بھرے نغموں کو سننے اور سنانے کی تمنا نئی نہیں، خواہشیں پہلے بھی تھیں کہ کاش کوئی غمگسار آئے، مدارا تیں کرے، دکھ بھرے نغمے سنائے، دکھ بھری باتیں کرے۔ جنبشِ لب کا ہر شعر شاعر کی خودکلامی ہی نہیں ہے یہ سامع اور قاری کو بھی اس جنبشِ لب کے ذریعہ اس خود آگاہی سے باخبر کرتا ہے جو دل سے اٹھے طوفان کا اشاریہ ہے، اس مجموعہ کلام سے سیرابی اور آسودگی دونوں حاصل ہوکر رہتی ہے۔ مولانا نعیم صدیقی ندوی، ڈاکٹر شباب الدین، ڈاکٹر الیاس الاعظمی اور خود شاعر کی تحریریں لذت مستزاد ہیں۔ ع۔ص

رسید کتب موصولہ

الطریق الی الفقہ: ابوطاہر المصباح، دارالقلم اشرف آباد، ڈھاکہ۔ قیمت: ۷۵/روپے

الطریق الی القرآن: ابوطاہر المصباح، دارالقلم اشرف آباد، ڈھاکہ۔ قیمت: ۱۴۰/روپے

الطریق الی تفسیر القرآن الکریم الجزء الثالث: ابوطاہر المصباح، دارالقلم اشرف آباد، ڈھاکہ۔

قیمت: ۲۵۰/روپے

الطریق الی القرآن الکریم: ابوطاہر المصباح، دارالقلم اشرف آباد، ڈھاکہ۔ قیمت: درج نہیں

تانیب الخطیب علی ماساقہ فی ترجمۃ ابی حنیفۃ من الاکاذیب:

محمد زاہد بن الحسن الکوثری ویلیہ الترحیب بنقد التانیب للاستاذ احمد خیری، الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ۔

قیمت: درج نہیں

تذکرۂ علمائے ہندوستان: مولانا سید محمد حسین بدایونی، تحقیق ڈاکٹر خوشتر نورانی، مکتبہ جام نور، ۴۲۲ مٹیا محل، جامع مسجد دہلی۔ قیمت: ۱۱۰۰/روپے

جبل پور میں اردو (۱۹۶۵ تک): فیروز کمال، اشفاق کمال، کمال کمپیوٹرس، گوہل پور جبل پور۔

قیمت: ۵۰۰/روپے

دی ہولی قرآن: ڈاکٹر نورالحسن، قاسم پورہ سونیاباد، مئوناتھ بھنجن یوپی۔ قیمت درج نہیں

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، افکار و جہات: ڈاکٹر سلیم قدوائی، اردو بک ریویو، 1739/3 نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس دریا گنج، نئی دہلی۔ قیمت: ۲۰۰/روپے

عقود الجواھر المنیفۃ فی ادلۃ مذھب الامام ابی حنیفہ: السید محمد مرتضی الحسینی الواسطی البلگرامی، الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ۔ قیمت درج نہیں

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں) علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	2200/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	300/-
شعر العجم دوم	150/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	200/-
شعر العجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس و دبیر	250/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	100/-
سفرنامہ روم و مصر و شام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات شبلی (فارسی)	45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی) مرتبہ: سید سلیمان ندوی	170/-
مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) 〃	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول 〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم 〃	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
February 2019 Vol - 203 (2)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/019
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

مطبوعات شبلی صدی

۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دار المصنّفین کے سو سال	کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس	ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۶۔	حیات شبلی	علامہ سید سلیمان ندوی	650/-
۷۔	مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۸۔	حیات سعدی	تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۹۔	شبلی شناسی کے اولین نقوش	مرتبہ: ظفر احمد صدیقی	600/-
۱۰۔	شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
۱۱۔	متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۲۔	یہود اور قرآن مجید	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
۱۳۔	رسائل شبلی	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۱۴۔	اردو ترجمہ مکاتیب شبلی	ڈاکٹر خالد ندیم	110/-
۱۵۔	تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	300/-
۱۶۔	مراسلات شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	150/-
۱۷۔	مطالعات شبلی	مرتبہ: اشتیاق احمد ظلی	550/-
۱۸۔	الفاروق (ہندی)	علامہ شبلی نعمانی	450/-
۱۹۔	الندوہ (جلد ۱۔۹)		4735/-